قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا پچھترواں سال

ماہنامہ

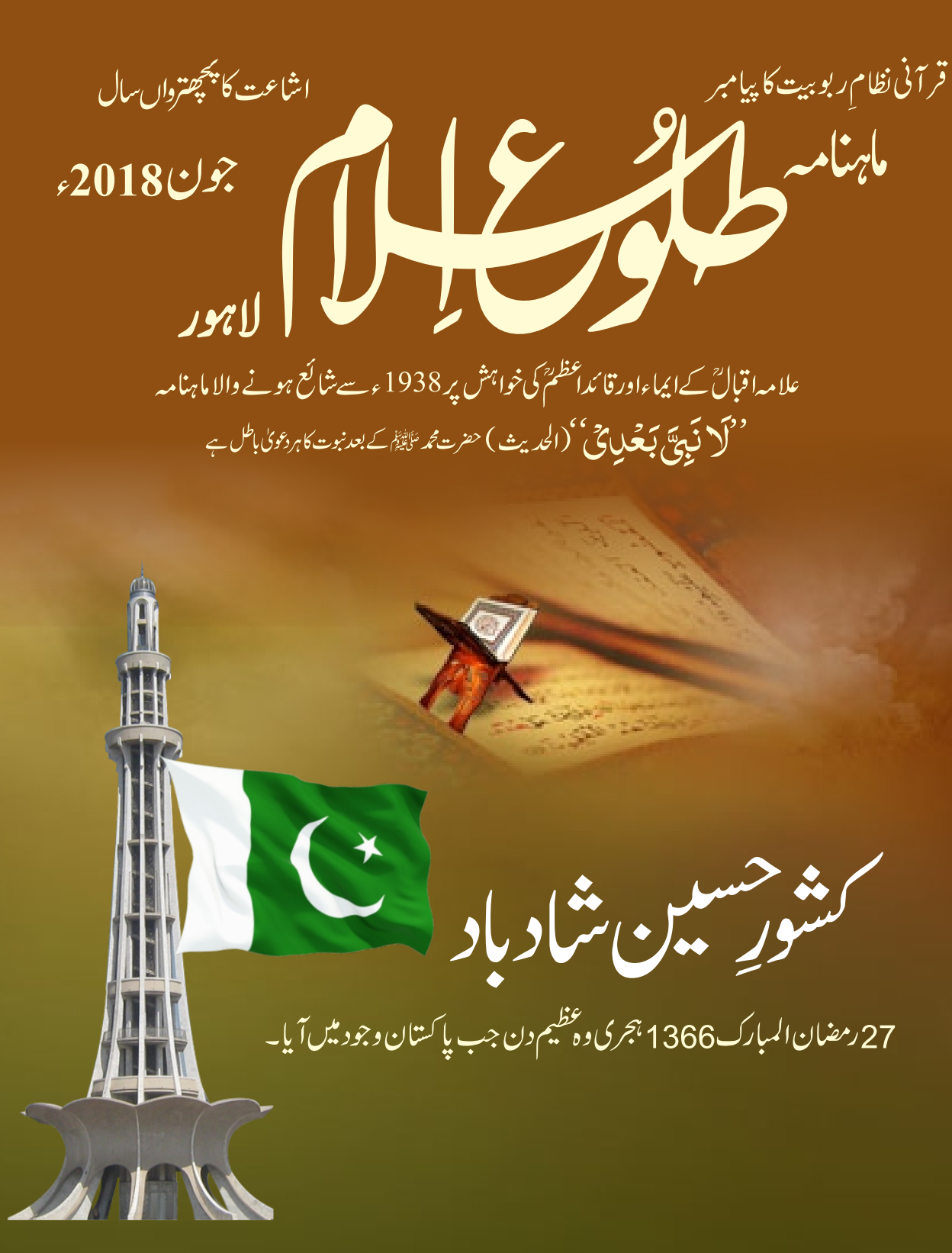
طلوعِ اسلام

لاہور

جون 2018ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



کشورِ حسین شاد باد

27 رمضان المبارک 1366 ہجری وہ عظیم دن جب پاکستان وجود میں آیا۔

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتمآب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جون 2018ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 06

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	ادارہ	4
روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں	مفہوم القرآن	8
روزوں کا مقصود و منتہیٰ	پرویز	11
الصلوٰۃ سے زندگی کا ربط	مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی	18
احمدیت (قسط نمبر 2)	خواجہ ازہر عباس، کراچی	26
کلمت اللہ اور سنۃ اللہ میں فرق کی نوعیت	ادارہ	34
للہ الحمد	محمد اکرم راٹھور	37
دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	39
بچوں کا صفحہ: ایسے "دوستوں" سے محتاط رہو	ادارہ	48
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا (نشست نمبر 6)	محمد علی صابر صدیقی	49

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 550 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com

www.facebook.com/Talueislam

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) – Message to Fellow-Seekers
By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) 59

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

عید الفطر

دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے۔ ہم بھی سال کے مختلف دنوں میں بعض تیوہار مناتے ہیں لیکن اس عید کا تہوار وہ ہے جسے بطور جشن مسرت منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ اس سے اس تیوہار کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سورہ یونس میں ہے:

''اے نوع انسان تمہارے رب کی جانب سے ایک ضابطہ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں سامان پرورش اور منزل انسانیت تک پہنچنے کی راہنمائی ہے۔''(10:57)-

اس کے بعد فرمایا:

''اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا بے مثال ضابطہ زندگی مل گیا ہے تم کیا اگر ساری دنیا کے انسان بھی مل کر کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا' لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسی قیمتی چیز کے اس طرح مفت مل جانے پر جشن مسرت مناؤ۔ وہ دولت کہ انسان جو کچھ بھی جمع کرے یہ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔''(10:58)-

یہ ہے وہ تقریب جسے بطور جشن منانے کی تاکید خدا نے کی ہے یعنی جشن نزول قرآن اور نزول قرآن کی ابتداء چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی (2:185) اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کے لئے تھا اور عید الفطر اس جشن کی تکمیل کا دن۔ پورے تیس دن کے روزے تیاری میں۔ یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بال آخر ہمیں دیا کیا ہے جس کے لئے ہم سے جشن مسرت منانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سوال کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کہا ہے کہ۔۔۔ اے رسول! ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو اس شمع نورانی کے ذریعے نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (10:57-58)۔ ذرا سوچئے کہ تاریکی میں کیا ہوتا ہے اور روشنی اس کی جگہ کیا کرتی ہے؟ تاریکی میں کسی شے کا مقام متعین نہیں ہوتا۔ روشنی میں ہر شے اپنی صحیح حقیقت کے ساتھ اپنے مقام پر نظر آ جاتی ہے۔ یہ تاریکی ہی ہے جس میں ہم رسی کو سانپ

اور سانپ۔ کو بعض اوقات رسی سمجھ لیتے ہیں۔ روشنی آ جانے سے رسی رسی اور سانپ سانپ کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔

نزول قرآن سے قبل تاریکیاں:

نزول قرآن سے پہلے انسان پر اس قدر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں کہ نہ وہ خارجی کائنات کی کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتا تھا نہ وہ اپنے مقام سے آگاہ تھا۔

یہ تاریکیاں کیا تھیں؟ دل و دماغ کی تاریکیاں، فکر و نظر کی تاریکیاں یعنی جہالت اور توہم پرستی کی تاریکیاں۔ مختصراً یہ کہ اپنے مقام سے بیگانگی کی تاریکیاں اور حقیقت یہ ہے کہ تمام تاریکیوں کا منبع یہی تاریکی تھی باقی سب تاریکیاں اس کی پیداوار تھیں۔ اگر انسان پر اس کا صحیح مقام روشن ہو جائے تو یہ تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کا صحیح مقام کیا بتایا ہے؟ اس سوال کی تفصیل میں جانا چاہیں تو اس کے لئے سارے کا سارا قرآن سامنے لانا پڑے گا جس کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں، لہٰذا اس کے صرف چند ایک گوشے ہی سامنے لائے جا سکتے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ نزول قرآن سے پہلے انسان کن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا اور کن پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ نزول قرآن کے وقت انسان کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔۔ انسان، انسان کی پرستش کرتا تھا۔ غلامی کا جواء اس کی گردن میں پڑا ہوا تھا۔ کہیں ملوکیت کا فولادی پنجہ اس کی رگ جان کو دبائے ہوئے تھا۔ کہیں رہبانیت کی غیر فطری زندگی اس کے دل و دماغ کو بری طرح ناکارہ بنائے ہوئے تھی۔ کہیں سرمایہ دار کی ہوس اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی تھی۔ یہ تھی انسان کی کیفیت۔

توہم پرستی:

جب قرآن آیا اور اس نے اعلان کیا کہ خدا کے اس رسول ﷺ کے ظہور کا مقصد یہ ہے کہ یہ ان تمام زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسان جکڑا چلا آ رہا ہے۔ یہ اس کے سر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ سے یہ کچلا جا رہا ہے (7:157)- ان زنجیروں میں سب سے پہلی زنجیر اس کی توہم پرستی کی تھی جس کی رو سے یہ خارجی کائنات کی ہر قوت سے ڈرتا تھا۔ بادل گرجا اور یہ سہم گیا۔ بجلی کڑکی اور یہ دبک کر بیٹھ گیا۔ پہاڑ سامنے آیا تو اس کی ہیبت سے لرز اٹھا۔ ان قوتوں کے خطرات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں ایک ہی طریق آ سکتا تھا اور وہ یہ کہ ان قوتوں کو خدا تسلیم کر لیا جائے، ان کے سامنے جھکا جائے، ان کی پرستش کی جائے، ان کے حضور قربانیاں دے کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔

مقام آدمیت:

خارجی قوتوں کے مقابلہ میں یہ تھا وہ مقام جو انسان نے اپنے لئے تجویز کر رکھا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے کہا کہ تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ۔۔۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے فائدے کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ (45:12-13, 31:20) اگر تم ذرا غور و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کا مقام کیا ہے اور تمہارا مقام کیا۔ یہ سب خادم ہیں اور انسان ان کا مخدوم۔ یہ سب قوانین خداوندی کے تابع

زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ جوں جوں تم ان قوانین کا علم حاصل کرتے جاؤ گے یہ قوتیں تمہارے سامنے جھکتی جائیں گی۔

سنت اللہ:

یہ قوانین جن کے مطابق یہ بڑی بڑی قوتیں مصروف عمل ہیں' اٹل ہیں' نہ بدلنے والے قوانین ہیں۔ اس لئے تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہونا چاہئے کہ نہ معلوم کس وقت یہ قانون بدل جائے اور یہ قوتیں میرے قابو سے نکل جائیں۔ یہاں پر ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے' قانون کے مطابق ہوتی رہے گی اور ان قوانین میں کبھی بھی تبدیلی نہیں آئے گی (33:62)- یہ تھا وہ آئینہ جس میں قرآن نے انسان کو اس کی حقیقی شکل دکھائی تو وہ ایک ہی جست میں مسجود ملائک اور مخدوم کائنات بن گیا۔ انسان کے لئے مجبور محض اشیائے کائنات کو مسخر کر لینا پھر بھی آسان تھا' مشکل مرحلہ وہ تھا جہاں انسان دوسرے انسان کے ظلم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیر انسانی حکمرانی کی تھی اور اس خوئے غلامی میں اسے اس قدر پختہ کر دیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کی محکومیت کو اپنی فطرت کا تقاضہ اور ان کا پیدائشی حق سمجھنے لگ گیا تھا۔

حق حکومت:

قرآن کریم آیا اور اس نے اعلان کیا کہ۔۔۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ خدا نے اسے کتاب' حکومت حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ دی ہو' کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میری محکومی اختیار کرو۔ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کتاب خداوندی کی اطاعت کرو جسے تم پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو (3:78-79)- آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے اس اعلان نے انسان کو کس طرح ہر قسم کی انسانی غلامی سے نجات دلا کر اسے ایک خدا کی محکومیت کی دعوت دی۔ قرآن کریم کی ساری تعلیم اسی بنیادی نقطہ کی شرح ہے کہ۔۔۔ اطاعت صرف قوانین خداوندی کی کرو' ان کے علاوہ کسی انسان کی اطاعت مت کرو (12:40)- انسان کا تخلیقی مقصد یہ ہے کہ وہ صرف قوانین خداوندی کی محکومیت کرے اگر اس نے اس کے علاوہ کسی اور کی محکومی اختیار کی تو یہ اس کی تخلیق کے مقصد کے خلاف ہوگا۔ یہ تو تھا ملوکیت کا ظلم جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ جھکنا انسان کے بدن کا تھا وہ چاہتا تو اپنے دل و دماغ کو اس سے آزاد رکھ سکتا تھا لیکن اس سے آگے انسان کے جھکنے کا وہ مقام آتا ہے جس میں اس کے دل و دماغ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

مذہبی پیشوائیت:

یہ غلامی تھی مذہبی پیشوائیت کی جو دوسرے انسانوں سے اپنی خدائی منواتی تھی۔ قرآن کریم نے انسان کو آواز دی اور اس سے کہا کہ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو مقدس نقابوں کی اوٹ میں خدا کے نمائندے بن کر تمہارے سامنے آتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ پیران طریقت ہوں یا علمائے شریعت ان کا سارا مسئلہ معاشی ہے لیکن یہ اسے مذہب کے پردے میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر کا یہ عالم ہے کہ خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں

(9:34)- دعویٰ ان کا یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی راہ بتاتے ہیں لیکن درحقیقت انہیں خدا کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔ یہ خدا سے ورے خود خدا بن بیٹھے ہیں۔ اس لئے خدا تک پہنچنے ہی نہیں دیتے' راستے میں ہی روک لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر لوگ خدا تک پہنچ جائیں یعنی اس کی اس کتاب کو اپنا راہنما بنا لیں تو ان خدا کے نمائندوں کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا دائرہ زندہ انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتا ان کی حکومت ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے بلکہ مرنے کے بعد ان کی گرہیں اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔ زندہ انسان ان مردوں کی بے پناہ قوتوں کے خیال سے کانپتا ہے' ان کے حضور منتیں مانتا اور نذانے گزارتا ہے۔ جہاں تک مُردوں کی غلامی کا تعلق تھا قرآن نے زندہ انسانوں سے کہا کہ ذرا سوچو کہ جن ہستیوں کو تم اپنا ''خدا'' سمجھ رہے ہو ان کی حالت یہ ہے کہ۔۔۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سن نہیں سکتے اور اگر وہ بفرضِ محال تمہاری پکار سن بھی لیں تو اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی بے خبری کی یہ حالت ہے کہ ان مردوں کو خود اپنے متعلق بھی علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے (46:4-5, 27:65, 25:3)- لہٰذا ان سے ڈرنا کیوں اور ان سے مرادیں کیوں وابستہ کرنا۔ یہ انسان کی انتہائی پستی ہے کہ وہ مُردوں سے ڈرتا رہے اور انہیں اپنا حاجت روا تسلیم کرے۔

منشورِ آزادی:

انسان کو انسان کے آگے جھکانے کی ایک موثر تدبیر یہ تھی کہ اسے روٹی کا محتاج بنا دیا جائے اور اس طرح اسے بھوکا رکھ کر اس سے اپنا حکم منوا لیا جائے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ رزق کے معاملے میں کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہے۔ ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں' ان کے بھی اور ان کی اولاد کے بھی۔ ہم ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کی ملکیت میں رہنے کے بجائے تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں اور کوئی کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو (17:31, 11:6, 6:152)- یہ تھے وہ تصورات جو قرآن نے دیئے اور اس طرح انسانوں کو ان کے صحیح مقام سے آگاہ کیا ((17:70 اور ان سے کہہ دیا کہ اگر تم قرآنی قوانین پر کاربند ہو گے تو تمہیں ایک ایسا معاشرہ میسر آ جائے گا جس میں کیفیت یہ ہو گی کہ تمہیں نہ کسی قسم کا خطرہ ہو گا نہ خوف و حزن (10:62-64, 7:35, 2:37-38)- بلکہ ہر طرح کا اطمینان اور ہر طرح کی سلامتی میسر ہو گی۔

مساواتِ انسانی:

اس میں ہر انسانی بچے کو زندگی کی دوڑ میں مقابلے کے لئے ایک جیسا میدان ملے گا۔ نہ کسی سے بے جا رعایت ہو گی نہ کسی کے راستے میں رکاوٹ آئے گی۔ جس کا جی چاہے اپنی محنت سے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے اپنی بے عملی سے پیچھے رہ جائے۔ یہاں ہر فیصلہ انسان کے جوہرِ ذاتی اور عملِ مسلسل کے مطابق ہو گا (99:7-8, 46:19)- یہ نہ ہو گا کہ بڑے باپ کا بیٹا سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہو اور غریب کا بیٹا ابتدائی تعلیم تک بھی نہ حاصل کر سکے کیونکہ اس کے باپ کے پاس اسے سکول میں داخل کروانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ یہ پیدائشی تفریق برہمن کی خود ساختہ زنجیریں تھیں جن میں وہ شودر کو جکڑے رکھتا تھا۔ قرآن کریم نے انسان کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے نوعِ انسان کو قرآن دیا گیا اور اسے کہا گیا تھا کہ ایسے منشورِ حریت و آزادی کے عطا ہونے پر جشن مناؤ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں

(مفہوم القرآن، سورۃ البقرہ، آیات 183 تا 188)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ فِدۡیَةٌ طَعَامُ مِسۡكِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾ (2:183-184)

لیکن میدانِ جنگ میں ثبات و اِستقامت کا سوال ہو، یا معاشرتی اور معاشی دنیا میں نظامِ عدل ومساوات کا قیام، یہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تمہیں اپنے آپ پر ضبط ہو۔ یعنی جب کبھی ایسا ہو کہ تمہارے کسی طبیعی (حیوانی) تقاضا اور بلند انسانی قدر میں ٹکراؤ ہو، تو تم اس قدر کو طبیعی تقاضا پر ترجیح دو۔ نیز تم جفاکشی اور مُشقت طلبی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لئے تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلی اقوام پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو سکو، اور زندگی کے سفر میں راستے کے خطرات سے محفوظ رہو۔ یہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں (گنتی کا تعین، بجائے خویش، ڈسپلن پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے)۔ پھر، جو کوئی تم میں سے مریض ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کر لے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں، لیکن اُس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ روزے کو بہ مشقت نباہ سکتا ہے (تو اُس کے لئے دوسرے اوقات میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اسے چاہئے کہ روزے کے عوض، کسی حاجتمند کی روٹی کا انتظام کر دے (اس سے، کم از کم، معذور اشخاص کا قلبی تعلق، اِس اجتماعی فریضہ کے ساتھ قائم رہے گا)۔

یہ ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ قانونی طور پر نہیں کیا جا سکتا کہ تم روزہ بہ مشقت نباہ سکتے ہو۔ یہ چیز تمہارے اپنے فیصلہ کرنے کی ہے۔ لہٰذا اپنی حالت کا جائزہ تم خود لو۔ اگر تم دیکھو کہ صورت بَین بَین ہے، تو پھر تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے، خواہ اس میں (مقابلۃً) تھوڑی سی مشقت بھی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ جو مقصد روزے سے حاصل ہو سکتا ہے وہ اُس کے فدیہ سے نہیں ہو سکتا ___ بشرطیکہ تم روزے کی حکمت سے واقف ہو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵ (2:185)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اس اجتماعی اور عسکری ٹریننگ (اور تربیتِ نفس) کے لیے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی ___ وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور اُبھری ہوئی ہے، اور جو مستقل اقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ روزوں کا نظم وضبط، اس عظیم پروگرام کے لئے مستعد رہنے کی سالانہ ٹریننگ ہے۔ سو جو شخص، اس مہینے میں، اپنے گھر پر موجود ہو، تو اُسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو مریض ہو، یا حالتِ سفر میں، تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ (اور جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتا ہو اس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ) خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تم دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلیا کرو۔

پھر سُن لو کہ روزے محض رسم پوری کرنے کے لئے نہیں۔ ان سے مقصد یہ ہے کہ تم اِس قابل ہو جاؤ کہ، خدا نے جو تمہیں راہ نمائی عطا کی ہے، اُس کے ذریعے تم قانونِ خداوندی کو ساری دنیا کے قوانین سے بلند کرسکو (9:33)۔ اور اس مقصد کے لئے تم جو کوشش کرو، وہ بھرپور نتائج کی حامل ہو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶ (2:186)

نہ ہی روزوں کے حکم سے، تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہونا چاہئے کہ، مادی لذتوں اور جسمانی ضرورتوں کے ترک کر دینے سے اِنسان خدا کا مُقرب بن جاتا ہے (جیسا کہ مسلکِ خانقاہیت میں، مختلف ریاضتوں اور مشقتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے)۔ (اے رسول ﷺ! جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کریں تو اُن سے کہہ دیں کہ میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ (وہ اس طرح کہ) جب بھی کوئی شخص، اپنی راہ نمائی کے لئے مجھے پکارتا ہے تو، میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے، اُس کی پکار کا جواب دیتا ہے (اور اُبھر کر اُس کے سامنے آجاتا ہے)۔ لہٰذا، اِن سے کہہ دو کہ قُربِ خداوندی کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ میرے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے، اس کی پوری پوری اطاعت کریں (7:56، 8:24، 16-32:15، 40:60، 42:26)۔ یہ ہے وہ طریق جس سے یہ دلائل وبراہین کی رُو سے، عقل وفکر کی روشنی میں، زندگی کے صحیح راستے پر پختگی سے چلتے رہیں گے۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے اعمال سے ہوگا (3:194)۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ (2:187)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے۔ رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی ___ بیویوں سے جنسی اختلاط، ''قربِ خداوندی'' کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصوّر ہے)۔ میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، اور ایسا قریبی رشتہ کہ اِن کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہوسکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے (57:27)۔ لہٰذا، خدا کا قانون، اس بارے میں، اِنسانوں کی خودساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے، اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہو رہے تھے، اُن سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم، رات کے وقت، منشائے قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنی بیویوں کے پاس بھی جاسکتے ہو اور کھاپی بھی سکتے ہو، تا آنکہ صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہوجائے۔ اس کے بعد، رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن اگر تم، اِس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لئے تربیت واطاعت کے مراکز (مساجد) میں رُکے ہوئے ہو، تاکہ تم اُلجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سُلجھا سکو، تو پھر تم اِن راتوں میں بھی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری یک سوئی سے معاملاتِ پیشِ نظر پر مرکوز رکھو)۔

بس یہ ہیں وہ حدود جو اِس باب میں قانونِ خداوندی نے مقرر کردی ہیں۔ اِن کی نگہداشت کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام وقوانین کو نمایاں طور پر بیان کردیتا ہے تاکہ لوگ اِن کی پوری پوری نگہداشت کرسکیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ (2:188)

اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ (جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے) روزے سے مقصد یہ ہے کہ تم میں ایسا ضبطِ نفس پیدا ہوجائے کہ تم، زندگی کے ہر گوشے میں، جائز اور ناجائز میں تمیز کرسکو، اور، خواہ تمہاری مفاد پرستی کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ (مثلاً) آپس میں ایک دوسرے کا مال، ناجائز طریق پر نہ کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک جاچکا ہے، تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے، حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کے نتائج کیا ہوا کرتے ہیں؟

روزوں سے تمہاری اس قسم کی تربیتِ ذات مقصود ہے۔

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزوں کا مقصود و منتہیٰ

(پرویز صاحبؒ کا ایک درسِ قرآنِ مجید)

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۂ بقرہ کی تین چار آیات (2:183۔187) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔(4:113)

''اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے''۔

کتاب کے معنیٰ احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد' ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا' بطیب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کی استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)۔ ''اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں''۔ یہ ''کتاب'' یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:183)۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (2:185) اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)۔

تَتَّقُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تَشْكُرُوْنَ ' سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2:185)

سب سے پہلے لفظ ''کبریائی'' کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط (10:78)

''تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے''۔ اس سے لفظ ''کبریائی'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں' یا رائے سرکشی نہیں: وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (45:37)۔ ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے''۔ دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ (43:84)۔ ''وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار''۔ (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ''اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (الْمُدَّثِّرُ کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ''اٹھ اور نوعِ انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے''۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (74:1-2)۔ ''اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو''۔۔۔ یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ''حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا''۔ اور اس سے آگے ہے: وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۔ (17:111) ''لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو''۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ: الْمُتَكَبِّرُ ۭ (59:23) کہا ہے۔ کہیں الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (13:9) اور کہیں: الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (22:62)۔ ہماری دنیا میں وہ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40:12)' تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے مین اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)۔

جولوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے' وعظ ونصیحت یا تقاریر وخطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔۔۔ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ (9:40)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے' عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9:33)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تا کہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظام خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت ورفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (48:29) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:139)۔ ''اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے''۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے گا۔ اس غلبہ وتسلط کے لئے قرآن کریم نے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ ''یعنی اگر تم مومن ہوئے تو''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں' کافر ہیں لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ:

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4:141)

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ الاعلی میں نہیں۔ سبحن ربی الاعلی۔۔ الا علی کے شایان شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں، جو ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہرمانیت ہے، مومن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط (7:146)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہو گی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تا کہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے، لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (2 ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟۔۔۔ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تا کہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور

جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185)۔ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔'' قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ قرار دیا ہی اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (10:58)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزول قرآن ہے۔ قرآن' خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزں کا مقصد۔ یعنی وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا با ترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ ''تاکہ تم خدا کی بڑائی کرو''۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس ''بڑائی بیان کرنے'' کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں' ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے با صد آہ و فغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور!

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اللہ اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے ہی مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہوسکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ:

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ''شہادت دیتا ہوں''۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار، اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ ''خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔'' وَالْمَلٰٓئِكَةُ ''اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں''۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ ''ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (17:3) ''خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الصلوٰۃ سے زندگی کا ربط

ایک دو جگہ نہیں، کئی سو جگہ قرآن مجید میں صلوٰۃ کا حکم، صلوٰۃ کا مقصد، اہل صلوٰۃ کی مدح وغیرہ موجود ہے۔ ہمیں اس وقت ان کی تفصیلات میں جانا نہیں، بلکہ صلوٰۃ کے ایک خاص پہلو کو اجاگر کرنا ہے اس زاویۂ نظر سے اگر صلوٰۃ کو نہ دیکھا جائے تو صرف صلوٰۃ ہی کی نہیں بلکہ پورے نظام عبادت کی وسیع دُنیا ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند ہو کر رہ جاتی ہے۔ صلوٰۃ کا ترجمہ ہماری زبان میں ''نماز'' کیا جاتا ہے۔ ہم بھی یہی لفظ استعمال کریں گے لیکن نماز کو محض چند حرکات و کلمات نہ سمجھا جائے۔ بلکہ اس سے صلوٰۃ ہی کا وہ وسیع مفہوم سمجھئے جس کی تھوڑی سی تشریح اس وقت پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ صلوٰۃ کو عموماً ہر جگہ اقامت سے وابستہ کیا گیا ہے۔ کہیں یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ کہا گیا ہے اور کسی جگہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ہے اور کسی جگہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ وغیرہ۔ جہاں صلوٰۃ اقامت کے بغیر ہے، وہاں نماز پڑھنا ہی سمجھنا چاہئے۔ مثلاً: مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوۃِ الۡفَجۡرِ وَحِیۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِیَابَکُمۡ مِّنَ الظَّہِیۡرَۃِ وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوۃِ الۡعِشَآءِ ؕ (24:58) وغیرہ۔

اقامت کے معنی ہیں قائم کرنا، قائم رکھنا۔ یہ لفظ کسی ایسے کام کے لئے نہیں آتا جو چند منٹ کے لئے ہوا اور پھر ختم ہو جائے۔ قرآن میں ہے۔ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ (42:13) دین قائم کرو۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ چند منٹ یا چند دن کے لئے دین قائم رکھو، اس کے بعد ختم کر دو۔

اور اقامتِ حدود اَنۡ یُّقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ ؕ (2:230) کا مطلب بھی اس کا مستقل قیام ہے۔ وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ (55:9) کا یہ مطلب نہیں کہ کبھی برابر تولو اور کبھی ڈنڈی مار لو، بلکہ یہ ایک مستقل کاروبار ہے۔

مختصر یہ کہ صرف نماز پڑھ لینے کا کام تو چند منٹ میں پورا ہو جاتا ہے، اس لئے اس پڑھ لینے پر لفظ اقامت صادق نہیں آتا۔ اقامت ایک ایسا فعل ہے جس میں قیام و دوام ہوتا ہے۔ گویا اقامت صلوٰۃ ایک نظام ہے جو چند منٹ بعد ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ دوامی طور پر قائم رہتا ہے۔ نماز کے کلمات و حرکات ایک جزو وقتی اظہار ہے ہمہ وقتی نظام صلوٰۃ کا اور یہ ایک ایسا نظام ہے جو پوری زندگی کے اعمال و وظائف کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک فوجی سپاہی جب اپنی پریڈ سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب یہ فوجی سپاہی نہیں رہا۔ وہ بہر حال ہمہ وقتی فوجی سپاہی ہے، پریڈ سے

پہلے بھی پریڈ کے وقت بھی اور پریڈ کے بعد بھی۔

اسی طرح ایک نمازی صرف اسی وقت نمازی نہیں رہتا، جب وہ نماز پڑھ رہا ہوتا ہے۔ وہ پڑھنے سے پہلے، پڑھنے کے دوران اور پڑھ چکنے کے بعد ہر حال میں نمازی ہے۔ کیونکہ اس کی پوری زندگی نماز ہے، اگر وہ مومن و مسلم ہے۔ اگر نماز پڑھنے سے پہلے اور بعد میں اس کی زندگی نماز نہیں تو اس کی نماز صرف پڑھ لینا تو ہے لیکن اقامت صلوٰۃ نہیں۔

صلوٰۃ کو قرآن نے جہاں نماز پڑھنے کے معنی میں لیا ہے۔ وہاں اس کا ایک بہت وسیع مفہوم بھی لیا ہے اور یہ معنی اقامتِ صلوٰۃ کے مفہوم سے قریب ترین رشتہ رکھتا ہے۔

ارشاد قرآنی ہے کہ:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسۡبِیۡحَہٗ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۱﴾ (24:41)

یعنی کیا تم دیکھتے نہیں کہ جو بھی زمین و آسمان میں ہے، وہ اور پروں کو پھیلائے ہوئے پرندے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہیں اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اسے جانتا ہے۔

ذرا سوچئے۔ کیا یہ اُڑتے ہوئے پرندے وضو کرتے ہیں؟ اذان کہتے ہیں؟ قبلہ رو ہو کر نیت باندھتے ہیں؟ قیام، رکوع، قومہ، سجود، تشہد کر کے سلام پھیرتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ پھر ان کی نماز کا کیا مطلب ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان کی صلوٰۃ کا مطلب فرائض وجود کی ادائیگی ہے جو ان کی اپنی اپنی جبلت و فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی صلوٰۃ کا مطلب بھی اس کے فرائض زندگی کی ادائیگی ہے اور یہی اقامت صلوٰۃ کا مفہوم ہے۔ محض صلوٰۃ یا نماز پڑھنا صرف ایک حصہ ہے اس پورے نظام اقامت کا جس کا تعلق انسان کی اختیاری زندگی سے ہے۔ وہ سپاہی کبھی سپاہی تصور نہیں کیا جا سکتا جو پریڈ میں حاضر ہو جایا کرے۔ لیکن نہ تو سپاہی کی زندگی اختیار کرے اور نہ سپاہی کے فرائض ادا کرے۔ مومن اللہ کا سپاہی ہے اور اس کا حال بھی اس سپاہی سے مختلف نہیں۔

غرض فرائض زندگی میں صرف نماز پڑھ لینا نہیں ہے۔ بے شمار دوسری چیزیں بھی ہیں۔ چوبیس گھنٹوں کی تمام نمازیں زیادہ سے زیادہ دو چار گھنٹے لے سکتی ہیں، باقی بیس بائیس گھنٹے کیا صلوٰۃ سے خالی رہنے چاہئیں؟ اگر وقت کا یہ بڑا حصہ صلوٰۃ سے خالی ہو اور صرف فرض و نفل نمازیں ادا کر لی جائیں تو ادائے صلوٰۃ تو شاید ہو جائے لیکن اقامتِ صلوٰۃ نہیں ہو سکتی۔ اقامتِ صلوٰۃ تو وہ پورا نظام ہے جس کی اقامت ساری زندگی کے وظائف و اعمال پر حاوی و محیط ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہئے کہ صلوٰۃ میں وہ تمام ذرائع و وسائل بھی داخل ہیں جو صلوٰۃ تک پہنچاتے ہیں یا جن کے بغیر ادائے صلوٰۃ نہیں ہو سکتی۔ اور اس صلوٰۃ میں وہ تمام مقاصد و نتائج بھی شامل ہیں جن کی تکمیل بذریعہ صلوٰۃ ہوتی ہے اس کی کچھ تشریح بھی سُن لینی چاہئے، اس سے کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ یہ اقامت صلوٰۃ کا نظام کس طرح پوری زندگی کے وظائف

واعمال پر حاوی ہے۔

ذرا غور کیجئے!

1۔فرض نماز اجتماعی طور پر ادا کی جاتی ہے اور جس جگہ ادا کی جاتی ہے اسے مسجد کہتے ہیں۔ ہر دور کے تمدن اور ہر ملک کے موسمی حالات کے مطابق مسجد تعمیر کرنا صلوٰۃ ہی کا ایک جزو ہے۔ یہ مساجد ہماری اجتماعی تربیت کا مرکز ہوتی ہیں لیکن یہ یوں ہی نہیں بن جاتیں۔ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اس میں پختہ اینٹیں، سیمنٹ، لوہا، لکڑی، رنگ، نقش ونگار، خطاطی، سنگ تراشی، انجینئرنگ، سمت کعبہ کی درستی وغیرہ سب کچھ صلوٰۃ ہی کا حصہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اینٹوں کا بھٹہ لگانا بھی صلوٰۃ ہے، سیمنٹ کا کارخانہ چلانا، لوہے کی فیکٹری لگانا، لکڑی چیرنے کی آرا مشین اور کارپینٹری، رنگ تیار کرنا، عمدہ نقش ونگار اور خطاطی کا فن، سنگ تراشی کا ہنر، انجینئری، سمتِ کعبہ درست کرنے کا جغرافیائی علم، چٹائیاں اور دریاں بنانے کا کام سب کچھ صلوٰۃ ہے۔ اگر وہاں گھڑی لگاتے ہیں تو گھڑی سازی کا کام بھی صلوٰۃ ہے، وہاں اگر برقی پنکھے، قمقمے اور لاؤڈ اسپیکر لگائیں تو پاور ہاؤس قائم کرنا بھی صلوٰۃ ہے۔ یہ تمام باتیں ہر جگہ اور ہر مسجد میں فی الحال نہیں اور ان میں کئی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے بغیر مسجد کا کام چل رہا ہے۔ لیکن اس کے جتنے ضروری اجزاء امکان واستطاعت کے مطابق شامل مسجد ہیں، وہ بہر حال صلوٰۃ ہیں اور آئندہ جو چیزیں شامل مسجد ہوتی رہیں گی، وہ بھی داخل صلوٰۃ ہوں گی۔ مسجد کا صلوٰۃ سے اتنا گہرا ربط ہے کہ قرآن میں عبادت گاہ کو موضع الصلوٰۃ کی بجائے تنہا، صلوٰۃ ہی کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ (22:40)

پس خود مسجد (سجدہ گاہ) صلوٰۃ ہے تو مسجد جن اجزاء سے مرکب ہوگی وہ سب صلوٰۃ ہی ہوں گے۔

2۔اس کے بعد دیکھئے صلوٰۃ کے لئے طہارت بدنی بھی ضروری ہے۔ بصورتِ جنابت غسل قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ (5:6) بدنی طہارت کے علاوہ کپڑوں کی طہارت بھی ضروری ہے۔ ان تمام طہارتوں کے بغیر نماز نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا طاہر ومطہر پانی حاصل کرنے کے جتنے وسائل ہیں وہ سب صلوٰۃ ہی ہیں۔ خواہ وہ کنوئیں کی کھدائی ہو یا ہینڈ پمپ کے لیے بورنگ کا ہنر ہو یا پائپ کے ذریعے ٹوٹیوں تک پانی لانے کے لئے واٹر ورکس کا انتظام ہو، سب کچھ صلوٰۃ ہی ہے۔

3۔ستر پوشی بھی نماز کے لیے ضروری ہے خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (7:31) پس گرم وسرد کپڑے تیار کرنے کے لئے جتنی ملیں یا کھڈیاں ہیں وہ بھی صلوٰۃ ہیں بلکہ انہیں سینے کے سوئیاں، مشینیں اور دھاگے تیار کرنا بھی صلوٰۃ ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کے بغیر وہ ستر پوشی نہیں ہوسکتی جو نماز کے لئے ضروری شرط ہے۔

4۔نماز میں شریک ہونے کے لئے جسمانی صحت بھی ضروری ہے۔ لہٰذا خالص غذاؤں کا اہتمام اور میڈیکل سائنس اور دوائیں تیار کرنے والے کارخانے بھی صلوٰۃ ہیں۔

5۔نماز میں یکسوئی خشوع وخضوع اور حضورِ قلب بھی ضروری ہے۔لہٰذا ایسا ہموار معاشرہ قائم کرنا بھی صلوٰۃ ہے،جس کا عادلانہ نظام ذہنوں کوسکون بخشے۔جہاں کی معاشی بدحالی دلوں کا چین نہ چھین لے، جہاں نہ حزنِ دوش ہواور نہ فکرِ فردا۔جہاں چوری ،اغواء،قتل، ڈاکہ،غصب،ظلم، ناانصافی ،جانبداری،طبقاتی تفاوت وغیرہ کا کوئی خوف نہ ہو۔جہاں ہرایک کے پاس مکان ہو۔بال بچوں کی تعلیم ،تربیت علاج ،خوراک، پوشاک اور روزگار کے لئے ترسنا نہ پڑے۔جہاں پرفرد کوترقی کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوں اور ہر شخص کو جینے کا حق ،خوش اور پُرسکون رہنے کا حق حاصل ہو۔ایسا معاشرہ قائم کرنا صرف جزوصلوٰۃ نہیں عین صلوٰۃ ہے۔ایسی عین صلوٰۃ جوصلوٰۃ کا اصل مقصد ہے اورصلوٰۃ کا لازمی تقاضا ہے۔ایسا معاشرہ قائم کرنے کی ہرکوشش عین جہاد فی سبیل اللہ ہے اوراس کوشش سے غفلت بے اعتنائی اور کوتاہی برتنا جہاد سے صریح روگردانی ہے۔اس جہاد کے بغیر محض نماز پڑھ لینا ایک بے روح بے کیف اور بے معنی سا عمل ہے۔

نتیجہ:

آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ محض نماز پڑھ لینا بس ایک عمل نماز ہے،لیکن یہ اقامت صلوٰۃ نہیں۔اقامتِ صلوٰۃ کا دائرہ اتناوسیع ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔صلوٰۃ جب مسجد کی چاردیواریوں سے باہر نکلتی ہے تو پوری زندگی پر پھیل کر اقامتِ صلوٰۃ بنتی ہے اور وہ ساری کوششیں جو اس نظام کے قیام کے لئے ہوں جہاد ہوتی ہیں اوراس جہاد میں جنگ،صلح معاہدہ،جنگی تیاریاں،اسلحہ سازی حکمت عملی غرض سب کچھ صلوٰۃ ہی ہوگی۔کیونکہ سب کا مقصد اقامتِ صلوٰۃ ہی ہے۔

یہ عجیب بات ہوگی کہ صرف نماز پڑھ لینا توصلوٰۃ ہواور وہ تمام چیزیں صلوٰۃ سے خارج ہوں جن کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی، یامحض رسمی نماز ہوتی ہے۔

صلوٰۃ وزکوٰۃ کا ربط:

اس سلسلے میں ایک بڑی حقیقت اوربھی پیش نظر رکھنی چاہئے اوروہ یہ ہے کہ قرآن میں بیشتر جگہ صلوٰۃ سے زکوٰۃ کووابستہ رکھا گیا ہے۔عموماً اقامت صلوٰۃ اورایتائے زکوٰۃ کوایک ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے۔جس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں،اوردونوں ایک ہی سکے کے دورخ ہیں۔زکوٰۃ بھی صلوٰۃ کی طرح ایک پورا نظام ہے اورصلوٰۃ ہی کی طرح زکوٰۃ بھی تفصیل چاہتی ہے۔لیکن یہاں مختصرلفظوں میں ددونوں کا ناقابل انقطاع ربط معلوم کرنے کے لیے اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ زکوٰۃ ایک ایسا معاشی نظام ہے جوسب کوخوشحال کردے اورکوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔یعنی دولت کی گردش ایسے انداز سے ہوتی رہے کہ سب کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔یہی وہ معاشرہ ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ زکوٰۃ کا یہ مطلب سمجھنا صحیح نہیں کہ ایک طبقہ دولت مندوں کا دوسرا خیرات پر پلنے والوں کا ہمیشہ موجود رہے۔اگر خوشحالی اتنی عام ہوجائے کہ کوئی زکوٰۃ کا لینے والا باقی نہ رہے تو نہ اللہ اور رسول ﷺ کواس کا افسوس ہوگا نہ اسلام کواس سے کوئی صدمہ ونقصان پہنچے گا۔بلکہ خوشی ہوگی کہ اسلام کا اصل مقصد پورا ہورہا ہے۔قتال کے ہزار فضائل ہوں لیکن یہ مقصود نہیں۔مقصد امن

وسلامتی ہے۔ اگر امن قائم ہوکر قتال ختم ہوجائے تو اس سے اسلام کے حکم قتال کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ بلکہ مقصدِ قتال پورا ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر خوشحالی عام ہوکر زکوٰۃ کا سسٹم ختم ہوجائے یعنی کوئی زکوٰۃ لینے والا غریب نہ رہے تو زکوٰۃ کا عظیم مقصد پورا ہوجائے گا۔ اس سے کسی اسلامی حکم کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اس مقصد کی تکمیل اگر ڈھائی فیصد لینے سے پوری ہو تو ڈھائی فیصد لیا جائے گا۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو زیادہ وصول کیا جائے۔

اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ (ترمذی عن فاطمہ بنت قیس)

اگر عفو یعنی زائد از ضرورت کل کی کل پونجی کی ضرورت ہو تو ''عفو'' لے لیا جائے اور کچھ بھی لینے کی ضرورت نہ ہو تو کچھ بھی نہ لیا جائے گا۔ یعنی ہر شخص محنت کرکے اپنا ثمرہ محنت (پیداوار) مملکت کے حوالے کردے گا اور نمائندہ گانِ مملکت اس کی تمام ضروریات کے ذمہ دار ہوں گے۔ ایسے نظام کا آپ جو بھی چاہیں نام رکھ لیں اس سے بحث نہیں، لیکن اسلامی نظام زکوٰۃ سے اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں بلکہ نظام زکوٰۃ کے مقصد کی تکمیل ہے۔

نظام زکوٰۃ اور اقامتِ صلوٰۃ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دونوں ایثار بے لوثی چاہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور دونوں مل کر اخلاق و معاش کے نظام کی تکمیل کرتے ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کا مقصد نظام زکوٰۃ کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ اخلاق اور معاش دونوں ایک دوسرے سے ایسے مربوط اور پیوستہ ہیں کہ اُن کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن پاک نے قصہ شعیب علیہ السلام میں اس حقیقت کو یوں بے نقاب کیا ہے کہ سیدنا شعیبؑ کا پیغام سن کر آپ کی اُمت نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ آپؑ کے پیغام صلوٰۃ کا مالیات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اُمت نے سوال کیا:

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ ﴿87﴾ (11:87)

ترجمہ: اے شعیب! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے بزرگانِ خاندان جس چیز کی عبادت کرتے آئے ہیں اُسے بھی چھوڑ دیں اور اپنے مال و دولت میں جو تصرف کرنا چاہیں وہ بھی نہ کریں!

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ قوم شعیبؑ بھی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ صلوٰۃ کا مطلب صرف نماز کا پڑھ لینا نہیں بلکہ اس کا تعلق براہِ راست مال و دولت کے کنٹرول سے بھی ہے، مگر یہ معمولی سا نکتہ ابھی تک ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں بھی مشکل سے آتا ہے۔ حالانکہ اس دور میں یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہوچکی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے پیغام کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ بس نماز پڑھے جاؤ اور دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہونے دو اور چونکہ ہر ایک کا مال اس کی ''ملکیت'' ہے، اس لئے اس میں کوئی دخل نہ دو۔

طبقاتی کشمکش کا اصلی سبب:

واقعہ یہ ہے کہ آدم سے لے کر تا ایں دم دُنیا میں جتنی کشمکش ہوتی رہی ہے اس کی تہہ میں محض نماز روزہ کا رفرمانہ تھا۔

روزے نماز سے اہل کفر کو کیا تکلیف تھی جو اہل ایمان اور پیغمبروں کی شدید مخالفت پر اتر آتے تھے؟ اہل کفر و شرک تو آج بھی نماز روزے کے پابند حضرات کے معتقد ہوتے ہیں اور انہیں بے نماز روزے خور سے بہتر ہی سمجھتے ہیں۔ ان کی انبیاءؑ اور مومنین جیسے پاکباز لوگوں کی دشمنی کرنے کی وجہ صرف نماز روزہ نہ تھی۔ اہل کفر اور اہل ایمان کی کشمکش کا سبب صرف یہ تھا کہ اسلام یعنی انبیاء سے انہیں اپنے مالی مفاد (ویسٹڈ انٹرسٹ) کو شدید خطرہ نظر آتا تھا اور واضح طور پر وہ سمجھتے تھے کہ یہ نماز صرف پوجا پاٹ نہیں۔ بلکہ سب سے پہلے یہ نماز استحصال کو ختم کرتی ہے۔ ان کے زائد از ضرورت مال پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ ان کی وہ مسند اقتدار چھینتی ہے جو محض دولت و ثروت کے سہارے قائم ہے۔ وہ ان تمام الٰہوں کو چکنا چور کرتی ہے جن میں سب سے بڑا مشہور الٰہ ثروت و دولت ہے۔ وہ صرف اس سونے کے بچھڑے ہی کی پوجا کو نہیں ختم کرتی جو سامری نے بنایا تھا۔ وہ سیم و زر کے ہر اس ڈھیر کو بت قرار دیتی ہے جسے قاضی الحاجات سمجھ کر اندوختہ کیا جاتا ہے اور ضرورت مندوں پر کُل کا کُل خرچ نہیں کیا جاتا۔ یہ بت پتھر کے بتوں سے کہیں زیادہ بڑا اور عزیز بت ہوتا ہے۔ اگر کسی بنئے سے یہ کہا جائے کہ یا تو تم لکشمی دیوی کا بُت ہمیں دے دو یا اپنی تجوری سے لاکھ روپے نکال کر ہمارے حوالے کر دو، ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں۔ تو وہ بنیا روپیہ کبھی نہیں دے گا۔ اپنا بت دے کر اپنی جان بچالے گا۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دولت لکشمی دیوی ہی کی برکت سے آئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اسے دولت پتھر کے معبود سے زیادہ عزیز ہے۔

کشمکش کا سبب:

یہ دولت ہی ہے جو ہمیشہ سے اب تک دنیا میں کشمکش کا سبب رہی ہے یعنی دُنیا میں رسمی نماز طبقاتی کشمکش کا سبب کبھی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہے تو صرف وہی نماز جس کو قوم شعیب علیہ السلام نے بھانپ لیا تھا کہ یہ محض رسمی پرستش نہیں بلکہ معاشی انصاف کی داعی اور نظام عدل کے لئے ساعی ہے اور دولت مندوں کو اپنی ذات پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ایسی صلوٰۃ کی ترغیب آج بھی دیجئے تو سارے مقدس سرمائے دار درمیان میں وہی مذہبی دلیل پیش کریں گے جو قوم شعیبؑ نے پیش کی تھی کہ کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آبائی دین کو ترک کر کے اپنے مالی نظام سے دست بردار ہو جائیں، اگر آپ انہیں سمجھائیں کہ اسلامی نظام زکوٰۃ انسانوں کو امیر و غریب کے دو متخالف طبقوں میں بانٹ کر کشمکش کو باقی رکھنا نہیں چاہتا تو یہ لوگ اس وقت بھی قوم شعیب علیہ السلام کی طرح کہہ اٹھیں گے کہ:

مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ (11:91)

''تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔''

قصصِ قرآنی اور تاریخی تقاضا:

قرآنی قصے دل بہلانے والی کہانیاں نہیں۔ وہ ایسے حقائق ہیں جن کو تاریخ دہراتی رہتی ہے۔ جو لوگ ان حقائق کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے، یا سمجھ کر چھپاتے ہیں وہ آخر کار داستان پارینہ یا عبرت کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کے دور

میں قوم شعیبؑ کی تاریخ دہرائی جارہی ہے۔اس قوم نے ترازو کی ڈنڈی مارنا اپنا پیشہ بنالیا تھا لیکن شاید یہ جُرم اتنا بڑا نہ تھا کہ ان کا طبقہ الٹ دیا جاتا۔ یہ تو اُن کی پوری سوسائٹی کے معاشی نظام اور اس کے غیر عادلانہ کردار کا ایک علامتی نشان تھا۔ان کا اصلی جرم انسان کو دو غیر متوازن طبقوں میں بانٹ دینا تھا۔ایک طرف بے نواؤں، مفلسوں اور فاقہ کشوں کی کراہتی ہوئی دنیا تھی اور دوسری جانب آسودہ حال عیش پسند مترفین کا ٹولہ تھا، جو دوسروں کو حق دیتے ہوئے ڈنڈی مارنا اپنا حق سمجھتا تھا۔اسے ہنر مندی سمجھ کر دولت کے ڈھیر جمع کرتا اور اس ثروت کے بل بوتے پر ظلم کو روا رکھتا تھا اور سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ اپنی دولت میں دوسرے حقداروں کا حق ایک لایعنی فعل سمجھتا تھا۔کس قدر عجیب بات ہے کہ ترازو کا ایک پلّا جھک جائے تو رضائے الٰہی کے خلاف ہو لیکن اگر پوری سوسائٹی کا ایک پلڑا جھک جائے اور دوسرا اُٹھ جائے اور کسی بات میں بھی توازن برقرار نہ ہو تو وہ رضائے خداوندی کے عین مطابق سمجھا جائے۔

قوم شعیبؑ کا جرم یہی تھا کہ وہ اپنی دولت میں سے کسی کا حصہ نکالنا نہ چاہتی تھی اور اسے اس کی ترغیب دی جاتی تو وہ یہ طنز کرتی کہ یہ اچھی صلوٰۃ ہے جو ہماری اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے نہ کرنے پر کنٹرول کرتی ہے۔

قصہ مختصر صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جاسکتا۔کیونکہ مالی نظام اور معاشی عدل کے بغیر رسمی نماز تو ہوسکتی ہے اقامت صلوٰۃ نہیں ہوسکتی۔اس لئے کہ اقامتِ صلوٰۃ زندگی کے جن بیشمار گوشوں کو محیط ہے، ان کی تکمیل کے لئے مالی ایثار، دولت کی صحیح تقسیم، معاشی عدل اور گردش دولت ناگزیر ہے۔اس لئے نظام زکوٰۃ بھی اقامتِ صلوٰۃ ہی کا ایک ضروری حصہ سمجھنا چاہئے۔

اخلاقی وروحانی اقدار:

صلوٰۃ کا نتیجہ قرآن نے یوں بتایا ہے:

---اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط ---(45:29)

''یقیناً نماز بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے بچاتی ہے۔''

صلوٰۃ سے اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو وہ صلوٰۃ کی ایک ظاہری رسم کی ادائیگی ہوگی۔مقصد صلوٰۃ کا حصول دراصل اقامتِ صلوٰۃ ہی کا ایک اہم حصہ ہے۔ایک غیر عادلانہ سوسائٹی بجائے خود ایک بڑی ناپسندیدہ بے حیائی ہے۔ایسی سوسائٹی میں بے حیائیوں اور جرائم کی فراوانی کوئی تعجب کی بات نہیں۔جس کے پاس ضروریات زندگی کی تکمیل کا سامان نہ ہو وہ اپنی تکمیل ضروریات کے لئے سب کچھ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے جو خلافِ جہاد اور خلاف تقویٰ ہوتا ہے۔وہ رشوت بھی لے گا چوری بھی کرے گا۔ڈنڈی بھی مارے گا۔ملاوٹ اور اسمگلنگ، چور بازاری میں بھی تعاون کرے گا، حتیٰ کہ جسم فروشی تک مجبور ہوگا۔کیونکہ اس کے زندہ رہنے کا سامان اسے میسر نہیں۔

دوسری طرف وہ طبقہ مترفین ہوتا ہے، جو ضروریات سے بہت زیادہ اندوختہ کرلیتا ہے اور اسی مالی فراوانی کے بل بوتے پر ہر قسم کی ناپسندیدہ بے حیائیوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔وہ دوسروں کی محنت اور عصمت دونوں کو خریدتا ہے۔انہیں ایسی

گومگو کی حالت میں رکھتا ہے کہ وہ نہ زندہ رہ سکیں نہ مرسکیں اور پھر مجبور ہوکر اپنی شکم پُری کے لئے ہر قسم کے جرائم کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ غرض دونوں طبقوں کی زندگیاں فحشا و منکر کا مظہر بن جاتی ہیں اور ان کی مثال ایسی ہوجاتی ہے جیسے ایک شخص جاری نہر کو روک کر سارا پانی اپنے کھیت میں ڈال لے اور دوسرے کی کھیتی میں پانی نہ جانے دے۔ اس روش کا ایک ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک کی کھیتی پانی کی زیادتی سے گل جاتی ہے اور دوسرے کی کھیتی پانی نہ ملنے سے جل جاتی ہے۔ نقصان دونوں کا ہوتا ہے۔ اگر اپنے حق کا پانی اعتدال کے ساتھ حاصل کرے اور دوسرے کے لئے باقی حصہ چھوڑ دے تو دونوں کی کھیتیاں سیراب ہوکر لہلہا اٹھیں گی اور دونوں کا بھلا ہوگا۔ یعنی دونوں طبقوں کے کردار میں اعتدال اور تقویٰ پیدا ہوکر معاشرہ فحشا و منکر سے پاک ہوگا اور صلوٰۃ کا مقصد پورا ہوگا۔

دوسرے لفظوں میں اقامتِ صلوٰۃ کا دائرہ صرف مادّی ضروریات ہی تک محدود نہیں رہے گا بلکہ کردار کی بلندی، اخلاق کی درستی، اقدار کی تخلیق بھی ہوگی۔ دیکھئے اقامتِ صلوٰۃ کی گیرائی کہاں تک پہنچی ہوئی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ میں تو پوری انفرادی اجتماعی زندگی اور زندگی کے سارے اعمال و وظائف آجاتے ہیں۔ اس میں مساوات انسانی کی تربیت بھی ہے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اس میں تنظیم اور ڈسپلن بھی ہے کہ ایک ایک آواز (Caution) پر پوری جماعت کھڑی ہوتی، جھکتی اور سربسجود ہوتی ہے۔

اس میں ایک ندائے ''حی علی الصلوٰۃ'' پر سب کے یکجا ہونے کی تعلیم بھی ہے۔ یہ کسی نیکی کے لئے ایک آواز پر جمع ہوکر تعاون کی مشق بھی ہے۔

اس میں وقت کی پابندی بھی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾ (4:103)

اس میں انسانی بڑائی کا خاتمہ اللہ کی کبریائی کے اقرار سے ہوجاتا ہے۔ اللہ اکبر بڑائی کرنے والوں کا احساس برتری اور دبے ہوؤں کا احساس کمتری ایک ساتھ دور کردیتا ہے۔

یہ ساری باتیں اس وقت اپنا اثر دکھاتی ہیں جب مسجد کے اندر کا یہ انداز مسجد سے باہر نکلنے کے بعد بھی قائم رہے۔ اگر یہ تربیت مسجد کی چاردیواری میں بند رہے تو صرف صلوٰۃ ہے اور اگر اس کا ظہور مسجد سے باہر پورے معاشرے میں ہو تو اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ کیونکہ اس وقت یہ صرف پرستش یا پوجا پاٹ کی رسمی نماز نہیں رہتی بلکہ پوری زندگی کے وظائف و اعمال کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخری قسط

احمدیت

(گذشتہ سے پیوستہ)

جس کے تمام عقائد خلافِ قرآن ہیں

(5) اب ہم اس مضمون کی پانچویں شق وفات ونزول مسیح کے موضوع پر گفتگو شروع کرتے ہیں۔

ہماری پیشوائیت حیاتِ مسیح کی قائل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں لیکن ہماری پیشوائیت کا یہ عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔ مرزا قادیانی نے علماء کے اس غلط اور خلافِ قرآن عقیدہ سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے اپنے دور میں جہاں جہاں مناظرے ہوتے تھے، یا تحریری مباحث ہوتے تھے، ہمارے علماء احمدی مولویوں سے شکست کھا جاتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ ہی قرآن کے خلاف تھا۔ جب مرزا قادیانی نے وفات مسیح کے عقیدہ کو لوگوں کے ذہن میں پختہ کر دیا تو پھر وہ قرآن کو چھوڑ کر روایات کی طرف آئے اور روایات کا سہارا پکڑا۔ جن میں حضرت مسیح کے آنے کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا:

''جب حضرت عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ خود دوبارہ دنیا میں نہیں آسکتے۔ اس لئے احادیث میں جو نزول مسیح کا ذکر ہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ وہ آنے والا حضرت مسیح کا مثل ہوگا اور وہ مثل یا مسیح موعود (جس کا حدیثوں میں وعدہ کیا گیا ہے) وہ میں ہوں۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں وہ مسیح موعود ہوں جس کے بارے میں خدا تعالیٰ کی تمام پاک کتابوں میں پیش گوئیاں ہیں کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔''

یہاں مرزا نے جو چابکدستی دکھائی وہ یہ ہے کہ اس نے وفاتِ مسیح تو قرآن سے ثابت کی، جو یقیناً درست ہے اور نزول وآمد مسیح کا عقیدہ روایات سے ثابت کیا کیونکہ قرآن میں نزول مسیح کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مرزا صاحب کی یہ بات اس وقت تسلیم کی جاسکتی ہے جب وہ نزول مسیح بھی قرآن سے ثابت کریں اور وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہمارے علماء بھی قرآن کے خلاف نظریہ رکھتے ہیں اور مرزا بھی قرآن کے خلاف۔ جب ہم نے وحی خفی اور الہام پر گفتگو کرتے ہوئے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ دونوں عقیدے قرآن کے خلاف ہیں اور روایات وحی نہیں ہیں ان میں آئندہ ہونے والے واقعات بیان نہیں کئے جاسکتے تھے۔ روایات دین کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ صرف دین کی تاریخ ہیں۔

(6) ہمارے مضمون کی چھٹی شق آمدِ مہدی ہے:

ہمارے علماء کرام آخری دور میں، قیامت کے قریب، امام مہدی کے تشریف لانے کے قائل ہیں۔ ہمارے علماء کرام کے اکثر وبیشتر عقائد قرآن کے خلاف روایات پر مبنی ہیں۔ علماء کا یہ نظریہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن مرزا نے اس کا پورا

پورا فائدہ اٹھایا۔ ہمارے علماء خود ہی کرسیاں بچھاتے ہیں اور جب ان پر کوئی آ کر بیٹھتا ہے تو اس پر جوتیاں برساتے ہیں۔ اگر علماء کا یہ خلافِ قرآن عقیدہ نہ ہوتا تو مرزا کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔

1953ء میں پنجاب میں احمدیوں کے خلاف فسادات ہوئے تھے جن کی وجوہات معلوم کرنے کے لئے حکومت نے منیر کمیشن قائم کیا تھا۔ یہ کمیشن جسٹس منیر اور جسٹس کیانی صاحب پر مشتمل تھا۔ جسٹس منیر کی اپنی شہرت احمدی ہونے کی تھی اور جسٹس کیانی معروف شیعہ تھے۔ اس منیر کمیشن نے دس تنقیحات قائم کی تھیں جن میں سے ایک تنقیح آمدِ مہدی کے متعلق تھی۔ اس کمیشن میں علاوہ اور دیگر علماء کے جناب مولانا مودودی مرحوم نے اپنا تحریری بیان جمع کرایا تھا۔ جناب مولانا مودودی مرحوم نے اپنا بیان تحریری طور پر پیش کیا تھا جو بعد میں طبع بھی ہو گیا تھا۔ اس کتابچے کا نام ہی ''بیان'' ہے مولانا کے اس بیان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ بیان ''انکوائری کمیشن'' کو دیا گیا تھا۔ یہ بیان خود مودودی صاحب، جماعت اسلامی اور جماعت کے تمام علماء کے عقائد کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس بیان کا پہلا فقرہ ہی یہ تھا کہ قرآن کریم میں امام مہدی کے تشریف لانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ عقیدہ روایات سے لیا گیا ہے۔ روایات میں ان کے آنے کا ذکر ہے۔

آمدِ مہدی کا عقیدہ بنیادی طور پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے۔ ان کے ہاں اس کے لئے ظہورِ مہدی کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے بارہویں امام عراق کے ایک قصبہ سامرہ کے ایک غار میں پوشیدہ ہو گئے تھے اور اب وہ آخری زمانہ میں وہاں سے باہر تشریف لائیں گے اور ان کا ظہور ہوگا۔ انہیں شیعہ حضرات امام مہدی یا امام آخر الزماں کہتے ہیں۔

ہم نے شروع میں تحریر کیا تھا اور بار بار تحریر کر رہے ہیں کہ مرزا نے ہمارے علماء کے خلاف قرآن عقائد کو ہی Exploit کیا تھا ہمارے علماء اگر ان خلافِ قرآن عقائد کو ترک کر دیں، تو احمدیت (اور شیعیت) خود ختم ہو جائے گی۔

دیگر خلافِ قرآن عقائد کی طرح یہ بھی ہمارے علماء کا خلافِ قرآن عقیدہ ہے۔ مرزا نے اس کا فائدہ اٹھایا اس نے اپنے دعویٰ کی تائید میں کہا: ''بخاری میں لکھا ہے کہ آسمان سے اس کے لئے آواز آئے گی کہ هذا خلفة الله المهدی، اب سوچو کہ یہ حدیث کس پایہ اور مرتبہ کی ہے کہ جو ایسی کتاب میں درج ہے جو صحیح الکتاب بعد از کتاب اللہ ہے۔''

(شہادت القرآن، صفحہ: 61)

آپ حیران ہوں گے کہ بخاری میں یہ نہیں لکھا ہے۔ مرزا نے یہ بہت بڑا جھوٹ بولا ہے اور عوام کو دھوکا دیا ہے۔ کتنا بڑا دھوکا ایک ''جھوٹے نبی'' سے سرزد ہوا۔

ہم نے مضمون کے شروع میں ہی وحی خفی کی تردید کر دی ہے اور اس کے بعد حضور خاتم النبیین کے پاس معلومات حاصل کرنے کے دو ہی ذرائع تھے۔ ایک ان کی بصیرت بشری (12:108) اور دوسرے قرآن کریم گذشتہ اور آئندہ کے واقعات جن کا علم حضور ﷺ کو دیا گیا تھا وہ سب وحی کے ذریعے دیا گیا جو قرآن میں محفوظ کر دیا۔ اور جن کا ذکر قرآن میں آ گیا۔ وحی الٰہی یعنی قرآن کے علاوہ آپ کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے آپ کو گذشتہ و آئندہ کے واقعات کا علم

حاصل ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ قرآن کے علاوہ اور کوئی غیب کا علم نہیں رکھتے تھے۔(6:50، 7: 188، 3: 44، 49: 11، 12:102، 3: 179، 72:26) چونکہ حضرت امام مہدی کی آمد کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ اس لئے یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے۔ حضور ﷺ ان کی آمد کی خبر نہیں دے سکتے تھے۔ نہ ہمارے علماء اس بارے میں کوئی آیت پیش کر سکتے ہیں۔

(7) ہمارے اس مضمون کی ساتویں شق فرقہ بندی ہے۔

قرآنِ کریم نے فرقہ بندی، کو شرک کہا ہے (30:32) دوسری جگہ فرمایا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ (3:103) ترجمہ: اور سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑے رہنا اور فرقے نہ بنانا۔ اس آیۂ کریمہ میں مسلمانوں کو تاکیدی حکم ہے کہ قرآن سے منسلک رہنا اور فرقہ نہ بنانا۔ آیت کے الفاظ واضح اور پُر اثر ہیں۔ آیت کا پہلا حصہ موجبہ ہے اور دوسرا حصہ سالبہ میں یہ نہی ہے کہ فرقہ نہ بننے دینا۔ اس طرح آیت کے مفہوم کو بہت Foreefully بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور فرقے نہ بنانا۔ آیت کے الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فرقہ بنتا ہی اس وقت ہے جب اللہ کی رسی ہاتھ سے چھوڑ دی جاتی ہے۔ جب تک اللہ کی رسی ہاتھ میں رہے گی، فرقہ نہیں بن سکتا آیت سے خوب واضح ہے کہ فرقہ بندی کی اصل وجہ اور اس کا بنیادی سبب قرآن کو چھوڑنا ہے۔ فرقہ پرست کا کوئی تعلق قرآن سے نہیں رہتا۔ اسی طرح فرقہ بندی کی مذمت میں ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ (6:159) جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے بنا لئے ہیں ان سے تمہیں (یعنی حضور کو کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق رسول اللہ ﷺ سے نہیں رہتا۔ ان تین آیات کریمات (3:103، 30:32، 6:160) سے علی الترتیب ثابت ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ تو قرآن سے رہتا ہے اور نہ اللہ و رسول ﷺ سے۔ اس کے علاوہ دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری کا عذاب (20:134)، بھوک اور خوف کا عذاب (16:112) برکات سماوی و ارضی کے لئے دروازوں کا بند ہونے کا عذاب (7:97) گروہ بندی اور پارٹی بازی کا عذاب (6:65)، لیکن افسوس کہ ہماری پیشوائیت اس شرک کو جائز سمجھتی ہے۔ ہر فرقے کے علیحدہ علیحدہ مدارس ہیں، ہر فرقے کی الگ الگ مساجد ہیں۔ ٹی وی چینلز پر ہر فرقے کے علماء فخر سے اپنے فرقے کی نمائندگی کا اعلان کرتے ہیں۔ رویت ہلال کمیٹی، اسلامی ریسرچ اکیڈمی میں ہر جگہ فرقوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ مرزا نے بھی فرقہ بندی کو جائز قرار دے کر جگہ جگہ اپنے فرقے کی تعریف کی ہے۔ اُس نے کسی ایک جگہ بھی فرقہ بندی کی مذمت نہیں کی۔ وہ تحریر کرتا ہے ''یاد رہے کہ مسلمانوں کے فرقوں میں سے یہ فرقہ جس کا مجھے خدا نے امام اور پیشوا اور رہبر مقرر کیا ہے۔ ایک بڑا امتیازی نشان اپنے ساتھ رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس فرقہ میں تلوار کا جہاد بالکل نہیں ہے اور نہ اس کی انتظار ہے۔ بلکہ یہ مبارک فرقہ، نہ ظاہر طور پر نہ پوشیدہ طور پر جہاد کی تعلیم کو ہرگز جائز نہیں سمجھتا۔

(اشتہار مندرجہ تبلیغ رسالت جلد نہم، صفحہ 82)

(8) اب ہم اپنے مضمون کی آٹھویں شق لیتے ہیں جس کا عنوان پیش گوئیاں کرنا ہے۔

ہمارے علماء کرام پیش گوئیوں کے قائل ہیں حالانکہ یہ عقیدہ قرآن کے بالکل خلاف ہے مرزا کی تو نبوت کا سارا دارومدار ہی پیش گوئیوں پر ہے۔ وہ اپنی نبوت کے ثبوت میں، اپنی وحی یا اپنی کتاب پیش نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنی نبوت کے ثبوت میں پیش گوئیاں پیش کرتے تھے۔ پیش گوئیوں کے بارے میں ''قرآنی فیصلے'' جلد دوم میں ایک سوال کے جواب میں جو تحریر ہے ہم وہ یہاں نقل کرتے ہیں آپ ملاحظہ فرمالیں۔

پیش گوئیاں:

(علم غیب، رسول ﷺ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا)

سوال: ''آپ نے میرے سابقہ استفسار کے جواب میں طلوعِ اسلام بابت ماہ مئی 1970ء میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ختم نبوت کا مسئلہ اس طرح واضح اور صاف ہوگیا ہے کہ اس باب میں کسی قسم کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں حیران ہوں کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق ہم اس قدر حساس واقع ہوئے ہیں (اور ہمیں ایسا حساس ہونا بھی چاہئے کیونکہ اسلام کی اصل بنیاد ہی ختم نبوت ہے) لیکن جس راستے سے یہ دروازہ کھولا جاتا ہے اس طرف ہماری نگاہ ہی نہیں جاتی۔ لاریب، یہ کشف والہام کا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹی ہے۔ فجزاک اللہ احسن الجزاء۔۔۔ اسی سلسلہ میں پیش گوئیوں کا سوال سامنے آتا ہے۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس کی بھی وضاحت فرمادیں کہ پیشین گوئیاں کرنے والوں کی پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی بہت سی الجھنیں دور ہوجائیں گی۔

جواب: کسی لمبی چوڑی بحث میں الجھے بغیر، تمہیداً اتنا سمجھ لیجئے کہ:

(1) پیشین گوئی کرنے والے کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیب کا علم جانتا ہے۔ (2) ''غیب کے علم'' سے مراد ہے وہ علم جو سمع وبصر وفواد (حواس) کے ذریعے حاصل نہ ہوسکے۔

اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم میں ہے کہ غیب کا علم خدا کے لیے مخصوص ہے اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰہِ (10:20) ''ان سے کہہ دو کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے۔'' دوسری جگہ ہے: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ ط (27:65) ''ان سے کہہ دو کہ ارض وسماء (کائنات) میں خدا کے سوا کوئی نہیں جسے غیب کا علم حاصل ہو۔''

(3) خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جس حد تک چاہتا ہے، غیب کا علم عطا کردیتا ہے۔ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ص (3:178) اور خدا ایسا کرتا ہی نہیں کہ تمہیں غیب پر مطلع کردے۔ ہاں، البتہ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اس مقصد کے لیے منتخب کرلیتا ہے۔ دوسری جگہ ہے عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ ۔۔۔ (72:26-27) خدا عالم الغیب ہے۔ وہ اپنے غیب کا علم کسی شخص پر ظاہر نہیں کرتا بجز اس رسول جسے وہ اس مقصد کے لئے چن لیتا ہے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ:

(i) عالم الغیب خدا ہے۔

(ii) وہ صرف رسولوں کو غیب کا علم عطا کرتا تھا، کسی اور کو نہیں۔

(4) رسولوں کو غیب کا علم وحی کے ذریعے ملتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ مثلاً حضرت مریمؑ کے کوائف حیات بیان کرنے کے بعد فرمایا: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ (3:44) یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم، اے رسولؐ! تیری طرف وحی کرتے ہیں۔۔۔ داستان حضرت نوحؑ بیان کرنے کے بعد کہا: تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۣ (11:49) اے رسولؐ! یہ غیب کی باتیں ہیں جنہیں ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ اس سے پہلے انہیں نہ تو جانتا تھا نہ تیری قوم۔ یہی الفاظ تذکرہ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں دہرائے گئے ہیں۔ یعنی ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ ۔۔۔(12:102)

(5) ان آیات سے واضح ہے کہ رسولوں کو غیب کا علم، بذریعہ وحی عطا ہوتا تھا۔ انہیں جن امور غیب کا علم بذریعہ وحی نہیں ملتا تھا، ان کا علم وہ از خود حاصل نہیں کر سکتے تھے اور واضح الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے تھے۔ خود نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کرایا گیا کہ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ۔۔۔(6:50، 11:31) اے رسول ﷺ! ان سے کہہ دو کہ میں قطعاً اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی اس کا دعویٰ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ میں تو صرف اس کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے کہ: وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۭ (7:188) (ان سے کہہ دو کہ) اگر میں غیب کا علم رکھتا تو میں اپنے لئے ڈھیروں دولت جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو تک نہ سکتی۔

(6) یہ بات کہ کوئی شخص مستقبل کا علم نہیں رکھ سکتا، ان واضح الفاظ میں کہہ دی کہ: وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (31:34) کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ اس کی موت کس خطۂ زمین میں واقع ہوگی۔ علیم و خبیر صرف خدا ہے، اور کوئی نہیں۔

(9) ہماری نویں شق استخارہ ہے:

ہمارے علماء کرام استخارہ کے بھی قائل ہیں کہ ایسے اہم معاملات جن میں عقل انسانی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی تو اس میں استخارہ کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح اس معاملہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت مل جاتی ہے کہ کوئی کام کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ اہل سنت کی نسبت شیعہ حضرات میں اس کا زیادہ رواج پایا جاتا ہے۔ جب کسی لڑکی کا رشتہ آتا ہے اور اس لڑکے کے Merits اور De-merits دونوں برابر ہوں اور لڑکی کے والدین تذبذب کا شکار ہوں تو اس معاملہ میں استخارہ کر لیا جاتا ہے۔ اگر استخارہ شادی کرنے کے لیے آیا ہے تو رشتہ منظور کر لیا جاتا ہے ورنہ اس سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی لڑکے کو بیک وقت دو ملازمتوں کی Offer آجائے تو ان میں استخارہ کر لیا جاتا ہے اور استخارہ کے مطابق عمل کر لیا جاتا ہے۔ استخارہ

کے خلاف عمل کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔ حضرت اقدس مولانا شبیر احمد عثمانی نے جمعیت العلماء ہند چھوڑ کر اپنی الگ جماعت جمعیت العلماء اسلام بنائی تھی جو Pro-League تھی۔ مولانا عثمانی کے بھانجے مفتی عتیق الرحمٰن کو اس بات کا بہت رنج تھا وہ مولانا حسین احمد مدنی کے بہت قریب تھے اور انہوں نے ان دونوں بزرگوں کے مکالمہ کا انتظام کیا۔ مفتی عتیق الرحمٰن کی کاوش سے یہ مکالمہ ہوا جو بعد میں مکالمۃ الصدرین کے نام سے طبع ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنی جمعیت العلماء ہند کے صدر تھے اور مولانا عثمانی جمعیت العلماء اسلام کے صدر تھے۔ اس لئے اس کتابچہ کا نام مکالمۃ الصدرین قرار پایا تھا۔ اس مکالمہ کے دوران بحث وتمحیص ہوئی اور مولانا عثمانی نے جمعیت العلماء ہند چھوڑنے کی وجوہات بیان فرمائیں۔ ان میں سے آخری دلیل مولانا عثمانی نے یہ بھی دی کہ میں نے بہت غور وفکر کرنے کے بعد استخارہ کیا اور جب استخارہ جمعیت کو چھوڑنے پر آ گیا تو میں نے جمعیت چھوڑی۔ آپ غور فرمائیں کہ مولانا نے اپنی زندگی کا کتنا بڑا فیصلہ استخارہ کی وجہ سے کیا۔ یہ فیصلہ ان کی زندگی کا Turning-Point تھا اور اس کا انحصار صرف استخارہ کا ایک دانے پر تھا۔

قارئین کرام کے ازدیادِ علم کی خاطر ہم استخارہ کرنے کا طریقہ بھی تحریر کرتے ہیں۔ استخارہ کے لغوی معنی خیر طلب کرنا ہے۔ استخارہ کرنے والا یعنی مستخیر جب استخارہ کرتا ہے تو وہ تسبیح ہاتھ میں لیتا ہے اور وہ استخارہ کرنے سے پہلے یہ طے کر لیتا ہے کہ دانوں کو الگ الگ کرنے کے بعد اگر جفت دانہ رہا تو میں کام کروں گا اور طاق دانہ رہا تو نہیں کروں گا یا اس کے یا اس کے Reverse کا فیصلہ کرے یہ مستخیر کی Choice ہوتی ہے۔ پھر وہ گیارہ تیرہ یا پندرہ مرتبہ درود شریف پڑھتا ہے اور اس کے بعد تین مرتبہ استخیر اللہ ربی خیراً عافیۃ پڑھتا ہے۔ پھر وہ تسبیح کے دانوں کو الگ الگ کرتا ہے اور پہلے سے طے شدہ فیصلہ کے مطابق، جفت اور طاق دانہ پر جیسا بھی وہ رہتا ہے، عمل کرتا ہے، بڑے سے بڑے کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کا انحصار تسبیح کے ایک دانے پر ہوتا ہے۔

(ضمناً یہ تحریر کیا جاتا ہے کہ مولانا عثمانی نے جمعیت العلماء ہند لیگ کی طرف رجحان کی وجہ سے نہیں چھوڑی تھی۔ بلکہ ان کے مولانا مدنی سے ذاتی اختلافات ہو گئے تھے۔ مولانا مدنی ان سے زیادہ بڑے اور زیادہ بااثر تھے اس لئے مولانا عثمانی تو دیوبند چھوڑ کر ڈھابیل (گجرات، بھارت) چلے گئے تھے اور وہاں کا دارالعلوم Join کر لیا تھا۔

یہ حضرات اس طرح علم الٰہی حاصل کرتے ہیں لیکن ہم نے شروع مضمون میں یہ ثابت کیا تھا کہ یہ علم صرف الفاظ کی شکل میں ملتا ہے۔ بغیر الفاظ کے علم الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے علماء کرام کا استخارہ پر عقیدہ بالکل خلافِ قرآن ہے۔ لیکن مرزا بھی اس کے قائل تھے۔ محمدی بیگم سے شادی کرنے کے بارے میں ایک اشتہار طبع ہوا تھا۔ طویل عبارت نقل کرنے سے مضمون کی طوالت کا اندیشہ ہے ہم مرزا کی عبارت کا ایک مختصر حصہ نقل کرتے ہیں۔ وہ محمدی بیگم کے قصہ کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں ''جیسا کہ ایک مدت سے بڑے بڑے کاموں میں ہماری عادت ہے جناب الٰہی میں استخارہ کر لینا چاہئے سو یہی جواب مکتوب الیہ (احمد بیگ) کو دیا گیا۔ پھر احمد بیگ کے متواتر اصرار سے استخارہ کیا گیا۔ وہ استخارہ کیا تھا گویا آسمانی نشانی

کی درخواست کا وقت آ پہنچا جس کو خدائے تعالیٰ نے اس پیرائے میں ظاہر کر دیا۔'' آپ غور فرما رہے ہیں کہ مرزا صاحب نے صرف اس موقع پر استخارہ نہیں کیا بلکہ یہ ان کی عادت مستمرہ تھی کہ وہ بڑے بڑے کاموں میں جناب اعلیٰ سے استخارہ فرمایا کرتے تھے۔ بہرحال علماء استخارہ کریں یا مرزا استخارہ کریں۔ استخارہ کرنا ہی قرآن کے خلاف ہے احمدیت کے فروغ کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کے اپنے عقیدہ قرآن کے خلاف ہیں۔

اب بھی احمدی حضرات سے بات کی جاسکتی ہے۔ ان میں سعید الفطرت اور سلیم الطبع لوگوں کی کمی نہیں۔ لیکن گفتگو میں صرف دو باتیں پیش نظر رہیں۔ تو احمدی حضرات دو قدم نہیں چل سکیں گے۔ پہلی بات تو یہ کہ: وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ط (42:10) حکم صرف قرآن ہوگا۔ حجت صرف قرآن ہے اور دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے تعلق، رابطہ صرف کلام کے ذریعے ہے اور کلام کے لئے الفاظ کا ہونا لازمی ہے۔ ان دو شرطوں کو پیش نظر رکھیں، پھر جس سے جس وقت، جس جگہ بھی بات ہوگی۔ فیصلہ قرآن کے مطابق آئے گا۔

(10) ہمارے مضمون کی دسویں شق محدث ہے (دال مفتوح کے ساتھ) یہ خالص شیعہ عقیدہ ہے اس لئے ہم فرقہ بندی سے اجتناب کرنے کی وجہ سے اس موضوع پر مختصر گفتگو کریں گے۔ یہ عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن ہمارے علماء اور مرزا دونوں اس کے قائل ہیں۔

یہ عقیدہ کہ ختم نبوت کے بعد بھی خدا انسانوں کو براہِ راست علم دیتا ہے (یعنی ان سے کلام کرتا ہے) اس عقیدہ نے ختم نبوت کے بعد بند کئے ہوئے دروازہ کو چوپٹ کھول دیا اور وضع وضع اور طرح طرح کے وہ عقائد بنائے جن کی رُو سے ہر شخص، ہر وقت، اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرسکتا ہے۔ الہام، کشف، القاء، رویائے صادقہ، استخارہ، تفاول یہ سب خلافِ قرآن عقائد ہیں، یہ قرآن کے خلاف ایک سازش ہیں اور ان پر عقیدہ رکھنے کے بعد قرآن کی عملی حقیقت بالکل ختم ہوجاتی ہے۔ اس میں ہمارے علماء اور مرزا ایک مقام پر کھڑے ہیں۔ یہ عقائد ہی فرقہ بندی اور مسلمانوں کے زوال وادبار کا سبب ہیں۔ ان ہی میں ایک عقیدہ محدث کا ہے محدث وہ ہے جو ملائکہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ ان کا کلام سنتا ہے۔ لیکن اُنہیں دیکھتا نہیں (الشافی، جلد اوّل، صفحہ:204) قرآن کریم میں محدث کا لفظ نہیں آیا۔ جب مرزا سے یہ سوال کیا گیا کہ محدث کا تو قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ آپ یہ دعویٰ کس طرح کرسکتے ہیں تو انہوں نے کہا: '' آپ لوگ کیوں قرآن شریف میں غور نہیں کرتے اور کیوں سوچنے کے وقت غلطی کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ صاحبوں کو خبر نہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ آنحضرت اس اُمت کے لئے بشارت دے رہے ہیں کہ اس اُمت میں بھی پہلی اُمتوں کی طرح محدث پیدا ہوں گے اور محدث بفتح دال وہ لوگ ہیں جن سے مکالمات ومخاطبات الٰہیہ ہوتے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباس کی قرات میں آیا ہے وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی ولا محدث الخ۔۔۔ پس اس آیت کی رُو سے بھی جسے بخاری نے لکھا ہے محدث کا الہام یقینی اور قطعی ہے جس میں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا۔ (اشاعت کردہ انجمن اشاعت، صفحہ:348، حاشیہ در حاشیہ 4)

آپ غور فرمائیں کہ مرزا اپنے دعویٰ کی تائید میں وہ آیت پیش کر رہے ہیں جو اس قرآن میں نہیں ہے جو ہمارے ہاں متداول ہے اور جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ حرفاً حرفاً درست ہے اور حضور ﷺ کے دور سے محفوظ چلا آیا ہے۔

احمدیت کے یہ دس بنیادی عقائد ہیں جو ہم نے آپ کی خدمت عالیہ میں پیش کئے ہیں۔ یہ سب خلافِ قرآن عقائد ہمارے علماء بھی درست سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ سب قرآن کے خلاف ہے۔

یہ مضمون بہت طویل ہو گیا ہے۔ اس مضمون میں ہم نے وہ آیات پیش نہیں کیں جو احمدی حضرات مرزا کی نبوت کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اگر قارئین کرام کو یہ مضمون پسند آیا تو ہم وہ آیات بھی پیش کر دیں گے اور ان کی درست تفسیر بھی لکھ دیں گے۔ البتہ ایک آیت جو احمدی حضرات بڑھ چڑھ کر ہر موقع پر دیتے ہیں ہم اس کا حوالہ دے دیتے ہیں۔

ارشادِ عالی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ (4:69)

ترجمہ: اور جس شخص نے اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کی تو ایسے لوگ ان بندوں کے ساتھ ہوں گے جنہیں اللہ نے اپنی نعمتیں دیں یعنی انبیاء صدیقین، شہدا اور صالحین اور یہ لوگ اچھے رفیق ہوں گے۔

احمدی حضرات کہتے ہیں کہ اللہ و رسولؐ کی اطاعت سے جب صدیقین، شہدا اور صالحین پیدا ہو سکتے ہیں تو انبیاء بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان سے سوال کیا گیا کہ امت میں 14 سو سال سے لوگ اللہ و رسولؐ کی اطاعت کر رہے ہیں اب تک کوئی رسول پیدا نہیں ہوا۔ احمدیت حضرات مرزا کی اطاعتِ خدا و رسول کو ان کے نبی ہونے کی وجہ سمجھتے ہیں۔

ان احمدی حضرات کو پرستش اور اطاعت کا فرق معلوم نہیں ہے مرزا پرستش اللہ کی کرتے تھے اور اطاعت برٹش گورنمنٹ کی کرتے تھے۔ وہ اپنی اس اطاعت پر اصرار بھی کرتے تھے اور فخر بھی کرتے تھے ہمارے علماء بھی پرستش اور اطاعت میں فرق نہیں کرتے۔ مسجد کے میناروں پر چڑھ کر اذان میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی حاکم نہیں۔ جب مسجد سے باہر نکلتے ہیں تو سپاہی کی ہدایت کے مطابق چوراھا پار کرتے ہیں۔ اطاعت اس نظام کی کرتے ہیں۔ چونکہ علماء بھی پرستش اور اطاعت میں فرق نہیں کرتے اس لئے انہوں نے یہ نکتہ مرزا کے سامنے پیش نہیں کیا۔

آخر میں ہم اپنے علماء کرام سے درخواست کریں گے کہ خدارا وہ اپنے عقائد پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ جو خلافِ قرآن عقائد ہیں ان کو ترک کر دیں۔ ہم احمدی حضرات سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مضمون کو تعصب کے بغیر بغور مطالعہ فرمائیں۔ اگر کوئی سوال یا اعتراض ہو، تو ہمیں لکھیں، طلوعِ اسلام کے صفحات ان کے لیے حاضر ہیں۔ لیکن گفتگو سنجیدہ اور با اخلاق ہو، اور آخری حجت صرف قرآن ہو۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کلمت اللہ اور سنۃ اللہ میں فرق کی نوعیت

بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ نے ایک جگہ کلمت اللہ کہا ہے دوسری جگہ سنۃ اللہ کہا ہے۔ وہ بھی تبدیل نہیں ہوتے، یہ بھی نہیں ہوتے۔ Law جب الفاظ میں ہوتا ہے، نظری اعتبار سے لاء جب ہوتا ہے قانون، وہ کلمہ کہلاتا ہے اور جب وہ پریکٹس میں لایا جاتا ہے تو اسے سنت کہتے ہیں۔ سارے سائنس کے تمام Laws جب وہ کتابوں کے اندر ہوتے ہیں تو وہ کلمات کہلاتے ہیں جسے آپ نظریۂ پاکستان کہتے تھے، یہ کلمہ تھا۔ یہ سنت بنتی تھی مملکت ملنے کے بعد جب اس کو پریکٹس میں لانا تھا۔ نظریہ یا کلمہ کتابوں کے اندر بند پڑا رہے کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا خواہ وہ غیر متبدل ہی کیوں نہ ہو۔ جب اس کو آپ Into Practice لاتے ہیں پھر وہ اپنے نتائج دیتا ہے۔ تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ نظریہ کے اعتبار سے دیکھئے جو کلمات یا قوانین ہم دیتے ہیں، ان میں اس اعتبار سے بھی کمی نہیں ہوگی۔ H_2O قیامت تک اسی طرح سے رہے گا، کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور اس کی سنت یہ ہے کہ جب بھی آپ آکسیجن اور ہائیڈروجن کو دو اور ایک کی نسبت سے اکٹھا ملائیں گے تو پانی کا قطرہ پیدا ہوگا وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا (33:62) یہ سنت اللہ ہے۔

جب نتائج نکلتے ہیں تو جہاں جہاں قرآن نے قوموں کے غلط نظام کے نتائج کا بیان کیا ہے ہر جگہ سنت کا لفظ لایا ہے۔ جہاں ان کی حفاظت کا ذکر کیا ہے وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں جب قرآن حکیم نازل ہوا ہے تو یہ کلمات اللہ، سنت اللہ میں ابھی سارے تبدیل نہ ہوئے ہوں وہاں تمت کلمت اللہ کہا ہے قرآن نے اور جہاں تاریخ میں یہ کلمات Into Practice آئے ہیں، انہوں نے نتیجہ پیدا کیا ہے سارے قرآن میں وہاں کلمہ نہیں آیا، سنت آیا ہے۔ کہا یہ چیز بدل نہیں سکتی۔

(پرویز تفسیر مطالب القرآن فی دروس الفرقان، جلد سورۃ التوبہ، ص:370)

توجہ فرمایئے

اس امر کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ ادارہ طلوع اسلام کا ملکی یا غیر ملکی کسی بھی سیاسی پارٹی یا فرقہ سے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی ادارہ طلوع اسلام خود کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ ہے۔ یہ صرف اور صرف ایک فکری اور علمی تحریک ہے۔

(چیئرمین ادارہ)

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیر قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔ **ادارہ طلوع اسلام** نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بجھوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تا کہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تا کہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المومنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(۵)	۴۵۰	۵۰۰/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(٦)	٦۰۰	٦۰۰/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(۷)	۴۸۰	۵۰۰/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(۷)	400	۵۰۰/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	۲۵۰/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(۹)	۵۳۰	۵۵۰/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(۱۰)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	300/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

للہ الحمد

علامہ غلام احمد پرویز (1903-1985) کے قرآنِ کریم کی تشریح وتفہیم پر مشتمل سلسلہ وار زبانی دروس کا ایک ریکارڈ، جسے اُس دوران تیار کئے گئے آڈیو اور ویڈیو ٹیپس سے مرتب کیا گیا ہے، ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' کے نام سے کتابی صورت میں 42 (بیالیس) ضخیم مجلدات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

علامہ مرحوم ایک متبحر عالم اور پینتالیس سے زائد معروف کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کی ان بابغۂ روزگار علمی شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے زورِ قلم اور قدرتِ بیان کی بدولت، اسلام کے دفاع اور جدید عصری تقاضوں اور مسائل کا قرآنی حل پیش کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ انکسارِ طبع کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ اپنے آپ کو قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم کہا اور سمجھا۔

علامہ مرحوم زندگی بھر فکرِ قرآنی کو عام کرنے میں مصروفِ تگ وتاز رہے۔ تحریر وتقریر کے اس سلسلہ کا آغاز بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے شروع ہی سے ہو گیا تھا جب ان کے مضامین غیر منقسم ہندوستان کے معتبر رسالوں میں چھپنے لگے اور پھر علامہ محمد اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر ماہنامہ طلوع اسلام 1938ء سے ان کی زیرِ نگرانی دہلی سے شائع ہونے لگا۔ اسی دوران شملہ اور دہلی میں جمعہ کے اجتماعات سے ان کے خطابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر تحریکِ پاکستان کے دوران بزمِ اقبال کی سٹیج سے انہوں نے ''تحریکِ پاکستان کی اسلامی اساس'' کے موضوع پر وقیع تقاریر فرمائیں۔

قیامِ پاکستان (14 اگست 1947ء) کے بعد ان کے درس کا آغاز 1950ء میں کراچی میں ہوا جس کا موضوع بالعموم ''قرآنی تعلیمات'' تھا۔ یہ درس اوائل 1958ء تک جاری رہا۔ علامہ مرحوم، ملازمت بطور اسسٹنٹ سیکرٹری مرکزی حکومتِ پاکستان سے قبل از وقت 1955ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور منتقل ہو گئے اور جولائی 1958ء سے یہ درس ان کی رہائش گاہ 25 بی گلبرگ۔ 2 لاہور پر ہونے لگا۔ یہاں شروع میں درس کے موضوعات ''قرآنِ کریم کے بنیادی تصورات اور مصطلحات'' رہے۔ اس دوران ملک بھر میں بزم ہائے طلوعِ اسلام قائم ہو چکی تھیں جن میں مرکزی حیثیت بزم لاہور کو حاصل تھی۔ لاہور میں درس اگرچہ مرحوم کی رہائش گاہ پر ہی ہوتا تھا لیکن اس کے اہتمام وانتظام کی ذمہ داری بزم لاہور پر تھی۔ بزم

لاہور اس معاملہ میں خوش قسمت ہے کہ قرآنِ کریم کے از سرِ نو باقاعدہ سلسلہ وار درس کا آغاز ان کے ہاں ستمبر 1960ء سے ہوا اور یہ پہلا دور بخیر وخوبی 31 دسمبر 1967ء کو اختتام پذیر ہوا۔

درسِ قرآنِ کریم کا دوسرا دور جو پہلے کی نسبت زیادہ مفصل انداز سے تھا، 17 مارچ 1968ء سے شروع ہو کر 15 اکتوبر 1984ء تک، تیسویں پارہ کی سورہ مطففین کی آیت 26 تک پہنچا تھا کہ محترم پرویز صاحب علیل ہو گئے اور ان کی وفات مورخہ 24 فروری 1985ء تک پھر درس کی محفل نہ جم سکی۔

درسِ قرآنِ کریم کے پہلے اور دوسرے دور کا اکثر ریکارڈ آڈیو ٹیپس پر تیار ہوا تھا لیکن مورخہ 17 جولائی 1981ء سے سورۃ الزخرف (43:19) سے درس ویڈیو ٹیپس پر ریکارڈ کیا جانے لگا تھا اور یہ انتظام آخر تک جاری رہا۔ یہی درس مرحوم کی وفات کے بعد سے آج تک بزم طلوعِ اسلام لاہور کے زیر انتظام سنایا دکھایا جا رہا ہے۔

اربابِ فکر ونظر نے دروس قرآن کے تحریری ریکارڈ میں لانے کے پروجیکٹ کو نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ دروس کے اس ریکارڈ کو پڑھتے ہوئے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم محترم پرویز صاحب کے درس میں شریک ہیں اور قرآنی نکات دل میں اترتے چلے جاتے ہیں اس فرق کے ساتھ کہ موصوف صاحبِ درس کو تو ہم مشکل مقام پر اُسی وقت دہرانے کا کہہ نہیں سکتے تھے البتہ ان کتابوں کے اوراق کسی بھی وقت پلٹ کر ہم ان کی صحبت میں دوبارہ جا سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی صد ہزار رحمتیں ہوں مرحوم پر۔ دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے کہ ان کے اندازِ تفہیم اور اثر انگیزی کو قبولیتِ عامہ نصیب ہو۔

علامہ مرحوم ساری عمر محض اشاعتِ کلامِ الٰہی کے جذبہ کے تحت یہ درس ارزانی فرماتے رہے اور کوئی معاشی فائدہ نہ مدِنظر رکھا، نہ حاصل کیا۔ ادارہ طلوعِ اسلام یہ اصول وجذبہ بدستور مدِنظر رکھ رہا ہے اور اس پروگرام کو غیر تجارتی بنیادوں پر بفضلِ ایزدی جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کا یہ پروگرام ہے کہ ان دروس کا حسبِ استطاعت اہم عالمی زبانوں میں بھی ترجمہ کروا کر شائع کیا جائے تا کہ ساری دنیا کے شائقین اس سے استفادہ کر سکیں اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو اور اس امر کی توفیق ارزانی فرمائے۔

محمد اکرم راٹھور
چیئرمین ادارہ طلوع اسلام
25 بی گلبرگ 2، لاہور

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر 15)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

انسان کی ذات اپنے اعمال کے اثرات لئے ہوئے آگے جائے گی۔ جب جسمانی نظام طبیعی قوانین کے تحت موت سے ہمکنار ہوگا، تو نشوونما یافتہ ذات کا کچھ نہیں بگڑے گا، بلکہ اس حیات نو میں اسے نیا پیکر دیا جائے گا، جو پہلے سے ارتقاء یافتہ ذات کے نتیجے میں، بہتر ہوگا، تاکہ مزید ارتقائی منازل کو طے کیا جا سکے، مگر ہم دنیاوی شعور کی سطح پر اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ جسمانی موت سے، غیر نشوونما یافتہ ذات بھی ختم نہیں ہوگی، وہ بھی منتقل ہو کر دوسرے مقام پر جائے گی، لیکن وہ مزید ارتقائی منازل طے نہیں کر سکے گی۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہوتا، وہ زندہ رہتا ہے، بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے، اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج ہے، جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا۔ انسانی ذات کو دوسرا پیکر عطا ہوگا، اسے ''حیاتِ نو یا دوبارہ زندہ ہونا'' کہیں گے۔

نظریہ مکافاتِ عمل کے منافی اُمت میں رسول سے منسوب روایت کی بنا پر یہ عقیدہ پھیلایا جا رہا ہے کہ نجات اعمال سے نہیں ہوتی، شفاعت پر ایمان لانے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا تجزیہ ضروری ہو جاتا ہے۔

شفاعت کے تصور کا تجزیہ:

اِس ضِمن میں زیادہ بحث میں اُلجھنے کی بجائے قرآن سے ایک ہی آیت کے حوالہ سے وضاحت کی جاتی ہے کہ:

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾ (6:15)

(اے رسول!) کہہ دو: اگر میں بھی اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی (دنیا و آخرت میں) ظہور نتائج کے دن سخت سزا ملے گی (کیونکہ اس کا قانون مکافات کسی کی رعایت نہیں کرتا)۔ رسول بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کی سزا سے نہیں بچ سکتا، تو شفاعت رسول ﷺ کا عقیدہ رکھنے والوں کو سوچنا چاہیے۔

خدا اس آیت کے الفاظ کو اس ذاتِ گرامی ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوا رہا ہے، جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر:

اتنی بڑی عظیم الشان ہستی کہہ رہی ہے کہ اگر میں بھی اپنے رب کے قوانین کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی (دنیا و آخرت میں) ظہور نتائج کے دن سخت سزا ملے گی۔ عدل تو کہتے ہی اس کو ہیں۔ قانون ہوتا ہی بے لاگ ہے۔ یہ فرد اور فرد میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اگر رعایتیں ملنی شروع ہو جائیں، تو پھر وہ قانون عدل پر نہیں رہتا۔ امت تو ایک طرف رہی، یہ آیت بتا

رہی ہے کہ رسول ﷺ خود بھی خدا کے قانون مکافات کے نتائج سے خوفزدہ رہتے تھے۔عیسائیت کے کفارے کے عقیدے، اور خود مسلمانوں کے شفاعتِ رسول ﷺ کے عقیدے کی جڑ کٹ گئی ہے۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی گالی ہی یہ ہوتی ہے کہ ''تم قیامت کے دن رسول ﷺ کی شفاعت سے محروم رہ جاؤ''۔عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کفارے پر ایمان کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی۔ بالکل عیسائیوں کی طرح ہمارے ہاں بھی حدیث گھڑ لی گئی، بلکہ حدیث کی بجائے روایت کہنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''نجات اعمال سے نہیں ہوتی، شفاعت پر ایمان لانے سے ہوتی ہے۔'' وہی عیسائیت کا عقیدہ لفظ بہ لفظ آپ کے ہاں داخل کر دیا گیا۔

مکافاتِ عمل کے نتائج کا سلسلہ جہانِ فردا تک جاری رہتا ہے:

قرآن کی رو سے زندگی کا سلسلہ اس سانس کے ساتھ ہی وابستہ نہیں کہ یہ منقطع ہوا، تو زندگی ختم ہوئی۔نہیں! زندگی مسلسل آگے چلتی ہے۔اور وہ اسی مقصد کے لیے آگے چلتی ہے کہ قانون مکافات عمل کی رو سے جو نتائج مرتب ہونے ہیں، وہ اگر اس زندگی میں مرتب نہیں ہوئے ہیں، تو اس سے آگے مسلسل زندگی چلتی ہے۔اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ نتائج اس دنیا میں سامنے آئیں یا مرنے کے بعد سامنے آجائیں۔انسان کے اعمال کے نتائج خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ہوں، ایک فرد کے ہوں یا ایک قوم کے ہوں، ایک نظام کے، ایک مملکت کے اعمال کے نتائج جب سامنے آتے ہیں، تو اسے کہا جاتا ہے یومِ مکافات یا روزِ مکافات یا یومِ قیامت۔یہ دن اِس زندگی میں بھی آسکتا ہے، موت کے بعد کی زندگی میں بھی آسکتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے کہا کہ میں روزِ مکافات، اگر کہیں خلاف ورزی ہوگئی ہوگی تو اُس کے نتائج، سے خائف ہوں نظریہ ذہنی مادہ کے مطابق، انسان دو مختلف مادوں یا اشیاء سے متشکل ہے لیکن یہ ذہن ہے جو میری ذات سے قریب تر ہے۔میرا ایک جسم ہے جس کی حرکات میری پابند ہیں لیکن وہ ''میں'' جو انہیں پابند بناتا ہے وہ جسم نہیں، بلکہ ذہن ہے۔یہ سچ ہے کہ جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ ''میرا ایک جسم ہے''، ہم کبھی کبھی یہ بھی کہتے ہیں کہ ''میرا ایک ذہن ہے''۔لیکن اس نظریہ کے مطابق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ''میں ایک ذہن ہوں'' جبکہ یہ کہنا کہ ''میں ایک جسم ہوں'' غلط ہوگا۔

یہ بھی سچ ہے کہ جب میں محض طبیعی خصوصیات کی بات کرتا ہوں تو میں خود کو جسم کے عین سمجھ سکتا ہوں، لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ ''میں سوچ رہا ہوں'' تو اشارہ ذہن کی جانب ہے نہ کہ جسم کی طرف کہ جو سوچ نہیں سکتا گو سوچنے کے لیے جسم (دماغ) کی ضرورت ہے جو فکر کرنے کے لیے شرط لازم ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ جسم میں دماغ خود فکر نہیں کرتا۔اسی طرح جب میں تسلیم یا یقین کرتا ہوں، حیرت کرتا ہوں۔خواب دیکھتا ہوں، احساس کرتا ہوں، درد یا لذت محسوس کرتا ہوں تو جسم ان میں کوئی چیز نہیں کرتا بلکہ ذہن کرتا ہے۔اسی لیے ذہن کو ہی میری اصل ذات کہا جاتا ہے۔ذہن کو چھوا یا دیکھا نہیں جاسکتا اور نہ ہی اس کا تصور کرنا ممکن ہے۔یہ جسم یا دماغ کے اندر نہیں ہوتا۔یہ غیر مادی ہے لہٰذا مکانیت کا حامل نہیں۔

ذہن کی زندگی میں پیش آنے والے وقوعات دماغ کی زندگی کے وقوعات سے علّی طور پر متعلق ہوتے ہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذہن دماغ میں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے باہر۔

ذہن اور جسم کے متوازی ہونے کا نظریہ:

اس نظریہ میں کہا جاتا ہے کہ:

ذہن اور جسم دو ایسے حقائق ہیں جو ایک دوسرے کو متاثر کئے بغیر اور ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر متوازی طور پر اپنا وجود رکھتے ہیں۔ جس طرح دو گھڑیاں ایک دوسرے سے آزاد صحیح وقت دیتی ہیں، اسی طرح ذہن و جسم دو حقائق ہیں اور اللہ نے ان کے درمیان ایسی نسبت رکھی ہے کہ ایک دوسرے سے متوازی عمل کرتے ہیں۔ یہ بھی ہمارے علم میں ہے کہ جسم کو تجربہ نہیں ہوتا اور ذہن کی ماہیئت خواہ کچھ بھی ہو، کم از کم یہ تجربات کا حامل ضرور ہوتا ہے۔

اقبال کا نظریہ ذات (خودی):

علامہ اقبال نے بھی انسانی ذات (علامہ کے اپنے الفاظ میں خودی) کا نظریہ قرآن کی روشنی میں اپنے کلام اور خطبات میں پیش کیا ہے اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں بلکہ اثبات خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک جوں جوں انسان اس فرد کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔

> ''خدا کی مانند'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفات خداوندی کو منعکس کرے، اور اس طرح اُس انائے مطلق کو اپنے اندر بحدِ بشریّت جذب کرتا چلا جائے۔

خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادہ شر ہے اور اس لیے قابل نفرت ہے۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی، موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو کر غیر فانی ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک انسانی ذات اس جہد مسلسل کا نام ہے، جو اپنی نشوونما کی راہ میں، موانعات کو دور کرتے ہوئے ارتقائی منازل طے کرتی چلی جائے۔ علامہ کے اپنے مخصوص انداز میں ؎

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی — یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اس ضمن میں مغربی مفکر پروفیسر جوڈ کا مؤقف بھی اہمیت کا حامل ہے:

پروفیسر جوڈ کا مؤقف:

علامہ اقبال تو قرآن ہی کی ترجمانی میں انسانی ذات، اور اُس کی اہمیت اُجاگر کرتے ہیں، لیکن اِس ضمن میں حکمائے مغرب کی ممتاز اتھارٹی پروفیسر جوڈ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ:

''انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل **طبیعی** نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی (انسانی ذات) کی ہوگی۔ پہلے پہل انسان طبیعی ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے مقام پر آیا۔ پھر اس نے صنعت وحرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات واسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اِس دور میں انسان نے صنعت وحرفت میں پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اِس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے، اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے۔ اُس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی (یعنی انسانی ذات کی نشوونما) کی طرف ہوگا۔''

پروفیسر جوڈ کا مؤقف یہی تائید کر رہا ہے کہ کائنات میں انسانی ذات کے حامل انسان کا مقام، اِس طبیعی کائنات میں ارتقاء کا آخری مقام ہے اور اب اُس کا مزید ارتقاء اُس کی ذات کی نشوونما میں مضمر ہوگا۔

برگسان کے نزدیک یہ ارتقاء عمل پیہم کی رو سے مرتب ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ موقوف ہوتا ہے اس بات پر کہ ہم کیا ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی درست ہے کہ ہم جو کچھ بنتے ہیں وہ اعمال ہی سے بنتے ہیں اسی اعتبار سے ہم مسلسل تخلیقِ ذات کرتے رہتے ہیں۔

یہ تخلیقی عمل آج بھی آگے کی جانب بڑھتے ہوئے بلند سطحوں کو چھو رہا ہے اور عین ممکن ہے کہ:

''انسان ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے نوع انسانی پر عائد کر رکھی ہیں۔''

اور اس طرح یہ انسان کی لافانیت کے مراحل میں بھی داخل ہو جائے کیونکہ جوشِ حیات کے لیے کچھ بھی کر گزرنا ناممکن نہیں ہے۔ یہ کسی بھی امکان کو اظہار و واقعیت کے پیکر میں ڈھالتے رہنے کا عمل ہے ایک ایسی انجانی دنیا کی طرف جو ابھی عالم وجود میں آئی ہی نہیں۔

انسانی ذات کے غیر فانی ہونے کی صِفت کی وضاحت:

انسانی جسم کے کثیر التعداد خلیات (Cells) ہر سانس میں ضائع ہوتے رہتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے خلیات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ فنا و تجدید مسلسل جاری رہتا ہے تا آنکہ کچھ وقت کے بعد سابقہ جسم تمام کا تمام ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اِس کے بالمقابل جسم کے ایک ایک ذرے کے تبدیل ہو جانے کے بعد بھی، ایک چیز بدستور قائم رہتی ہے، اور اُس میں قطعاً کوئی فرق نہیں آتا۔

وہ چیز انسانی ذات ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ''میں'' نے یہ کہا تھا، تو اِس سے مراد میرا جسم نہیں ہوتا، بلکہ یہی ذات (Personality) مراد ہوتی ہے۔

ایک مغربی مفکر باردیو نے کہا کہ انسانی ذات تغیر میں ثبات personality is changelessness in change ہے۔ اُس کا یہ قول دراصل برگسان ہی کے قول میں ایک اضافہ ہے کہ "We change without Ceasing" یعنی ہم میں تغیر آتا ہے، معدوم ہوئے بغیر۔

یہاں تغیر سے مفہوم یہ ہے کہ جس چیز میں تغیر آتا ہے وہ باقی نہیں رہتی، معدوم ہو جاتی ہے۔ برگسان یہاں یہ کہتا ہے کہ

انسانی ذات ایک ایسی شے ہے، جس کی وجہ سے ہم تغیرات سے پیہم گزرنے کے باوجود معدوم نہیں ہوتے۔ "میں" ہمیشہ وہی رہتی ہے۔ اِس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

راشڈل نے اسی اصول پر اخلاقیات کی ساری عمارت قائم ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا کہ:

''اخلاقی نظام کا دارومدار ہی اِس مسلمہ پر ہے کہ "میں" اپنے تمام گذشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں۔ اِس لئے اگر کچھ عرصہ کے بعد ''میں'' وہ نہیں رہتا، جو پہلے تھا، تو اِس صورت میں، میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی قرار نہیں پاتا۔ اگر صورتِ حال یہ ہو، تو پھر کسی شخص پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام ہی عائد نہیں کیا جا سکتا۔''

پروفیسر شروڈنگر نے اس نفس انسانی یا میں کا تجزیہ اپنی کتاب کے خاتمے میں یوں کیا ہے کہ ''میں'' کیا ہے۔

اگر آپ اس کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ کے مجموعہ سے کچھ زیادہ ہے یہ وہ پردہ ہے جس پر حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا بغور مطالعہ کریں گے تو آپ پر حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ ''میں'' کہتے ہیں وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر حافظہ اور تجربہ کی عمارت اٹھتی ہے..... اگر کوئی ماہر عمل تنویم ایسا بھی کر دے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت ذہن سے محو ہو جائے تو تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری ''میں'' کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔ انسانی ذات کبھی ضائع نہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکے گی۔

اس ضمن میں اوسپنسکی گرجیف کے الفاظ میں وضاحت کرتا ہے کہ:

اگر انسان ہر آن بدلتا رہے اور اس میں کوئی شے ایسی نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں کوئی شے ایسی نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن اگر وہ خارجی اثرات سے آزاد ہو جائے۔ اگر اس میں اس شے کی نمود ہو جائے جو اپنی زندگی جیئے تو یہ شے کبھی مر نہیں سکتی۔ عام حالات میں ہم ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں۔ خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہم بھی بدل جاتے ہیں یعنی اس طرح ہمارے بہت سے ''انا'' فنا ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے اور اس طرح طبیعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اِسے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ:

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

ایک جرمن ماہر حیاتیات ڈریش (Driesh) نے معمل (تجربہ گاہ) کے اندر تجربات کر کے ثابت کیا ہے کہ جسم حیوانی کے اندر ایک ایسا مقصد یا مدّعا کارفرما ہوتا ہے جو اس کی شکل وصورت کو متعیّن کرتا ہے۔

ڈریش کے تجربات اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حیوان جسم کی ایک خاص شکل وصورت کو حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لیے ایک اندرونی میلان کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک مجموعہ اشیاء کی طرح نہیں بلکہ ایک ناقابلِ تقسیم کلّ یا وحدت کی طرح عمل کرتا ہے جس کے اندر ایک رجحان طبیعت ایسا ہے جو اس کل یا وحدت کی ضروریات کی خبر رکھتا ہے۔

اسی طرح برگسان ارتقاء کے اُن تمام نظریات کو غلط قرار دیتا ہے جو زندگی کی تخلیقی اور مُدعائی فعلیت (Purpose activity) کی بجائے کشمکش حیات کی ضرورت اور بقائے اصلح کے تصور پر مبنی ہیں۔

برگسان کی وضاحت:

حقیقت کا سب سے اہم تشکیلی وصف اس کے اندر سرایت کردہ حیاتی قوت وتحریک ہے، جسے برگسان اصطلاحاً ''جوش حیات'' کے نام سے موسوم کرتا ہے اور جسے زندگی اور شعور کی صورتوں میں مدرک کیا جا سکتا ہے۔ اس جوش حیات (Elan vital) کا ارتقائی عمل نہ صرف یہ کہ کائنات کو غیر طبیعی قانون (Non-Physical Laws) کے تحت ہر لمحہ متغیّر بنائے رکھنا ہے بلکہ ایک پورا دشتِ امکان اس کے سامنے کھول دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سے ایک فنکار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے زیر اثر نئی سے نئی روشن تر اور بہتر ایک دنیا اپنے کینوس پر ابھار کر منظر عام پر لاتا رہتا ہے اور پھر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ تخلیق کا اگلا لمحہ کب اور کس طرح ایک نئی صدرنگ دنیا کو جنم دے گا۔

اوسپنسکی کی وضاحت:

فکر جدید کی رو سے انسان محض مادی عناصر کا مرکب نہیں جس میں ہر آن تغیر واقع ہوتا رہتا ہے بلکہ اس کے اندر ذات (روح اور عقل) بھی ودیعت کی گئی ہے جو مستقل ہے اور اسے خارجی تغیرات سے غیر متاثر رکھا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ذات جو مضمر حالت میں انسان کے اندر پیدائش سے موجود رہتی ہے اس حالت میں ہمیشہ رہتی ہے یا اسمیں مقصد بھی ہوتا ہے جس کی تکمیل سے اس میں پختگی آتی جاتی ہے۔ اس کو بالفاظ دیگر اس کا ارتقاء کہا جاتا ہے یہ مفکرین اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانی ذات میں نشوونما کے امکانات ہوتے ہیں اور اس کا نشوونما اور تکمیل درحقیقت مقصود زندگی ہے۔

اوسپنسکی اس باب میں گرجیف کے الفاظ میں کہتا ہے کہ:

انسانی ارتقاء سے مفہوم یہ ہے کہ ذات کے ان قویٰ اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پا سکتیں یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ صرف اس نہج کی نشوونما، صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کی حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے اس کے علاوہ اور کسی چیز کو انسانی ارتقاء کا مقصد نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی ذات کی صفات کی آگاہی کے بعد، ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ ارسطو کی زبان میں انسانی حیات کے مقصد سے روشناسی کر سکیں۔

قرآن کی سورہ اخلاص میں ذات کی اساسی خصوصیات کا ذکر:

انسانی ذات کی ماہیت کیا ہے یہ نہ بتایا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات کو خدا نے ''جدید یا منفرد تخلیق'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے یہ نہ تو طبیعی ارتقاء کی پیداوار ہے اور نہ ہی طبیعی قوانین کے تابع جن کے مطابق انسانی مشینری زندہ اور مصروفِ عمل رہتی ہے۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار وارادہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک غیر مادی ''شے'' ہے جو اختیار وارادہ کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس اختیار وارادہ کی آزادی میں انتخاب کرنے میں اسے عقل اور علم کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔

یہ دونوں صفات (بصورت مطلق اور کُلی طور پر) خدا کو حاصل ہیں اور اس کی عطا کردہ (محدود شکل میں) انسان کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کسی اور کو اختیار وارادہ یا عقل وفکر کی صلاحیتیں حاصل نہیں۔ ذات کی یہ لازم خصوصیات لامحدود

طور پر اللہ اور محدود طور پر انسان کو حاصل ہیں، ذات خواہ خدا کی ہو یا پھر انسان کی، اِس کی بنیادی صِفات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اللہ نے اِن کا ذکر سورہ اخلاص میں یوں کیا ہے کہ:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (4-1:112)

''تو کہہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا، اور نہ وہ کسی سے جنا۔ اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی ہے۔''

اس سورہ میں ذاتِ خداوندی کی چار اساسی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ انسانی ذات بھی چونکہ بہ حدِ بشریت خدا کی صفات کو اپنی ذات میں منعکس کرنے کی استعداد رکھتی ہے، لہٰذا، اگر خدا کی صفات کو انسان حدِ بشریت اپنے اندر جس قدر منعکس کر لے، تو اسی تناظر میں یہ صفات اس کی ذات کا بھی امتیازِ خصوصی کہلانے کی مستحق ہیں۔

1۔ پہلی صفت احد:

احدیت، ایک بڑی جامع اصطلاح ہے، جس کا ترجمہ ایک لفظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں تفرید (Uniqueness)، توحید (One-ness) اور وحدت و جامعیّت (wholeness) کے تمام رشتے آ جاتے ہیں۔ اس صفتِ تفرید میں کسی اور شے کی آمیزش کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اقبال کے الفاظ میں ''گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں''۔

2۔ دوسری صفت صمد:

یہ بھی ایک جامع لفظ ہے، جس کا مفہوم ہے خارجی سہاروں سے مستغنی ہونا، اپنے ارادوں کا مالک آپ ہونا، اپنے فیصلوں میں خود مختار ہونا۔ ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ اختیار و اراہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس کی نشوونما اپنے ہی اعمال صالحہ سے ہو سکتی ہے، جنہیں انسان اپنے اختیار و ارادہ سے بطیبِ خاطر خود کرے۔ نہ مجبوری کی نیکی، نیکی ہے اور نہ مجبوری کی بدی، بدی ہے۔ واضح رہے کہ ذات کا اپنی مرضی سے اپنے اوپر پابندی عائد کر لینا، اس کی آزادی کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ تو ذات کے اختیار و ارادہ کا مظہر ہے۔ آزادی کے منافی وہ پابندی ہے، جسے کوئی دوسرا اس کی مرضی کے خلاف عائد کرے۔ اپنے اوپر پابندیاں خود ذاتِ خداوندی نے بھی عائد کر رکھی ہیں۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (6:54)

''تمہارے رب نے رحمت (اور ربوبیت) کو اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے۔''

انسان بھی اپنی ذات کی نشوونما کے لیے، جو پابندیاں بطیبِ خاطر خود اپنے اوپر عائد کرتا ہے، وہ اس کے شرفِ انسانیت کے منافی نہیں ہوتیں۔ قرآنی معاشرہ، آزادی اور پابندی کے اسی بنیادی تصور کا مظہر ہوتا ہے جس میں افراد کی ذات نشوونما پاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔

3۔ تیسری صفت لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ یعنی غیر تولید:

اِس کا عام مفہوم ہے کہ نہ اس نے کسی کو بسلسلۂ تولید پیدا کیا، اور نہ وہ کسی سے بسلسلۂ تولید پیدا ہوا ہے۔ یہ بھی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ انسانی جسم بسلسلہ تولید (Procreation) پیدا ہوتا ہے۔ یہ ''پیدائش'' کی حیوانی سطح ہے۔ اس

سے ایک فرد اپنے باپ کی اولاد بنتا ہے، اور پھر اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات، پیدائش کے اس سلسلہ کا نتیجہ نہیں۔ پیدائش بسلسلہ توالد وتناسل میں مرد کا ایک حصہ اس سے الگ ہوکر بیٹے کے جسم کا جزو بنتا ہے۔ لیکن ذات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس کے حصے بخرے نہیں ہوسکتے۔ اگر ذات کا کوئی حصہ اس سے الگ ہوجائے تو ذات نامکمل رہ جاتی ہے، اور ذات کا نامکمل ہونا ذات کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے۔

4۔ چوتھی صفت کفو:

اِس کا مفہوم ہے کہ اس کا ہم پلہ اور ہمسر کوئی نہیں۔

جس فرد یا قوم کے افراد کی ذات کی نشوونما ہورہی ہے، دنیا کا کوئی فرد یا قوم اس کی ہمسر نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کے متعلق فرمایا ہے کہ:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (3:139)

''اور سُست نہ ہو، اور نہ غم کھاؤ، اور تم ہی غالب (اعلیٰ) رہو گے، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مومنین یعنی وہ لوگ، جن کی ذات کی نشوونما ہورہی ہو، ان کا کوئی ہم پلہ اور ہمسر نہیں ہوتا۔ اقبال کے مخصوص الفاظ میں:

مومنے، بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

نظریہ ارتقاء اور قرآن کی روشنی میں حیاتِ ذاتِ انسانی کا مقصد:

جیسا کہ ہم نظریہ ارتقاء میں مطالعہ کرچکے ہیں، قرآن سے بھی ہمیں اشارہ ملتا ہے کہ ہر شے کی تدبیر عالم مشیّت (عالم امر) میں اس کے السماء یعنی صورت/ مقصد کو مدِ نظر رکھ کر ہوتی ہے، لیکن آغاز اس کے پست درجہ (ارض) سے شروع کیا جاتا ہے۔ یہاں سے وہ ارتقاء کرتا ہوا اپنے بالائی حصہ میں عروج کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے البتہ اس کی وضاحت کی ہے کہ اگر ارتقاء کا سبب فی الواقع یہ ہے کہ حیوان کے اندر کوئی ایسا مقصد کام کررہا ہے جو اس مقصد سے بھی اوپر ہے اور جس نے اسے اپنا آلہ کار بنا رکھا ہے تو پھر لازماً اس تصور کے نتائج حسبِ ذیل ہوں گے۔

1۔ یہ مقصد اپنے آپ کو ٹھیک طرح جانتا ہے اور اپنی اغراض کے لیے حیوان کی شکل وصورت کو بدلنے پہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

2۔ چونکہ سب سے پہلا جاندار جو کیچڑ میں پیدا ہوا تھا۔ شروع ہی سے ارتقاء کے عمل میں تھا اور ارتقاء کی آئندہ غرضوں اور اُمیدوں کے عین مطابق تھا۔ اس لیے یہی مقصد تھا جس نے اس جاندار کو پیدا کیا تھا۔

3۔ چونکہ اس جاندار کے وجود میں آنے سے پہلے مادی کائنات اپنے تمام ارتقائی مدارج طے کرکے ایک ایسی شکل میں موجود تھی جس کے بغیر یہ جاندار وجود میں نہیں آسکتا تھا۔ لہٰذا مادی کائنات کا ارتقاء اس جاندار کی تخلیق ہی کی ایک تیاری تھی اور

اس ارتقاء کا باعث بھی یہی مقصد تھا۔

4۔ پھر چونکہ مادہ کی اوّلین صورت بھی شروع ہی سے ارتقاء کے عمل میں تھی اور بعد کے مادی ارتقاء کے لیے موزوں بھی تھی اس لیے یہی وہ مقصد تھا جس نے مادہ کو نیست سے ہست کیا تھا۔

5۔ لہٰذا یہ مقصد کوئی مادی چیز نہیں اور محض ایک مقصد ہی نہیں بلکہ ایک خود شناس شعور یا نفس (Mind) ہے بلکہ ایک خلاق وقدیر شخصیت (Personality) ہے جو کائنات کی اصل حقیقت ہے۔

حکمائے مغرب کے نظریہ ارتقاء میں ہم ارسطو کے نظریہ کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ چکے ہیں کہ منطقی لحاظ سے کسی شے کی غایت (یعنی بالائی نقطۂ تکمیل) اس کے آغاز سے پہلے طے کیا جا چکا ہوتا ہے جو ہمارے وقت کے لحاظ سے، بعد میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ارسطو کہتا ہے کہ کوئی شے عدم سے وجود میں نہیں آتی بلکہ وہ بالقوہ سے بالفعل ہو جاتی ہے۔ حرکت وتغیر نام ہے بالقوہ کا بالفعل یا مادے کا شکل وصورت اختیار کرنے کا۔ یہ حرکت میکانکی نہیں ہے بلکہ مقصدی اور غائی ہے۔ اس طرح مقصد یا غایت ہی تغیر وحرکت کا اصل سبب ہے۔ جب کوئی شے حرکت میں آتی ہے یا تغیر پذیر ہوتی ہے تو کوئی قوت اسے پیچھے سے نہیں دھکیل رہی ہوتی بلکہ اس کا مقصد یا غایت، سامنے سے اسے کشش کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا منطقی لحاظ سے مقصد وغایت، مزید ارتقاء سے پہلے طے ہوگا اگرچہ وقت کے لحاظ سے، وہ بعد میں آئے گا۔ (جاری ہے)

سانحہ ارتحال

رسالہ پریس جا رہا تھا کہ محترم عمران شاہد صاحب کے ذریعہ اطلاع ملی کہ محترم عبدالرشید قریشی صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام ٹورانٹو، کینیڈا اس دنیا میں نہیں رہے۔ عبدالرشید قریشی صاحب بزم ٹورانٹو کے قدیمی ارکان میں سے تھے اور گذشتہ 32 سال کے دوران وہ کئی مرتبہ بزم ٹورانٹو کے نمائندہ اور ممبر کے طور پر رضا کارانہ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ گذشتہ کچھ ماہ سے علیل ہو گئے تھے اور بزم طلوع اسلام ٹورانٹو کینیڈا کی نمائندگی کے امور نبٹانے کے لئے بزم کے اراکین پر مشتمل ایک ایگزیکٹو کمیٹی تشکیل دے دی تھی۔ جس کی اطلاع ادارہ کو بھی دے دی گئی تھی۔

مرحوم متحمل مزاج اور قرآنی کردار کی حامل شخصیت تھے۔ آخر دم تک فکرِ قرآنی کے تعارف وتوسیع کے لئے کوشاں رہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور ان کے اقرباء واعزہ کو صبر جمیل سے نوازے۔ ادارہ عبدالرشید قریشی صاحب کے اہل خاندان اور بزم طلوع اسلام ٹورانٹو کے احباب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

ایسے "دوستوں" سے محتاط رہو

شہزاد، فیضان اور جنید آپس میں دوست تھے۔ ان کے تعلقات ایک دوسرے سے بہت اچھے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد فیضان نے محسوس کیا کہ شہزاد اس سے کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔ ان کی دوستی میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی۔ فیضان نے کئی دفعہ شہزاد سے پوچھا بھی کہ اس کی ناراضی کی کیا وجہ ہے؟ لیکن وہ ہمیشہ بات ٹال دیتا۔ آہستہ آہستہ ان کی بول چال بھی بند ہوگئی۔

شہزاد کے ابّا کو اس کا علم ہوا تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ وہ فیضان کو جانتے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ انہوں نے ایک دن شہزاد سے پوچھا کہ وہ فیضان سے کیوں ناراض ہوگیا ہے؟ پہلے تو وہ چپ رہا لیکن بعد میں بتایا:

''ابّا جان! فیضان اچھا لڑکا نہیں، میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔ وہ میرے متعلق لڑکوں سے بُری بُری باتیں کرتا رہتا ہے۔ اس نے مجھے بدنام کر دیا ہے۔''

شہزاد کے ابّا کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے شہزاد سے پوچھا: ''بیٹا! تمہیں ان باتوں کا علم کیسے ہوا؟''

اس نے کہا کہ مجھے جنید نے بتایا ہے۔ وہ مجھے فیضان کی باتیں اکثر بتاتا رہتا ہے۔

شہزاد کے ابّا نے پوچھا: ''بیٹا! کیا تم نے یہ بات فیضان سے بھی پوچھی ہے؟''

شہزاد نے جواب دیا: ''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ فیضان سے پوچھتا پھروں۔ جنید جھوٹ تھوڑا بولتا ہے؟ اسے جھوٹ بولنے کی کیا پڑی تھی؟''

شہزاد کے والد نے بات آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔

انہوں نے ایک دن شہزاد کی موجودگی میں فیضان کو اپنے گھر بلایا اور جو کچھ شہزاد نے کہا تھا اس کے متعلق فیضان سے پوچھا۔ فیضان یہ سن کر حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ چچا جان! میں نے ان میں سے ایک لفظ بھی کسی سے نہیں کہا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ پھر انہوں نے جنید کو بلایا اور اس کے سامنے یہ سب کچھ دہرایا۔ اس پر جنید کا جھوٹ سامنے آ گیا۔

شہزاد کے ابّا نے شہزاد کو سمجھایا: ''بیٹا! زندگی میں یہ اصول ہمیشہ یاد رکھو۔ جب کوئی شخص تم سے کہے کہ فلاں نے تمہارے متعلق یہ کہا ہے تو اس کی بات پر فوراً یقین مت کر لو۔ اسے اس شخص کے سامنے لے جاؤ اور ان دونوں کے سامنے وہ بات پوچھو۔ جھوٹ سچ نکھر کر سامنے آ جائے گا۔ یاد رکھو! ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں جو دوست بن کر دوسروں کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلائیں۔ ان سے ہمیشہ بچنا چاہئے۔''

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 6

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

آج موسم بڑا خوشگوار ہے۔ کلیم الزماں اور ان کا پورا خاندان صبح سویرے ناشتا کر رہا ہے۔ گرم گرم چائے کے ساتھ بہت کچھ کھانے کی میز پر رکھا ہوا ہے اور ہر کوئی اپنی پسند کے مطابق ناشتہ کرنے میں مصروف ہے، اچانک جہاں آرا جو اپنے میکے میں آئی ہوئی ہیں بول اٹھتی ہیں۔

جہاں آرا: امی! آج تو حلیم کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ بیٹی کی خواہش کا خیال کرتے ہوئے کلیم الزماں اپنی بیگم حلیمہ صاحبہ کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔

کلیم الزماں: بیگم صاحبہ! آج تو میری بیٹی نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے لیکن میری ایک درخواست ہے کہ حلیم پکاؤ تو اسم بامسمیٰ نہیں ہونا چاہیے۔ حلیمہ صاحبہ نے کلیم الزماں کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا کہ عقیل صاحب کو وہ چیز پسند نہیں جو آپ چاہتے ہیں۔ ذرا مرچیں زیادہ ہوئیں تو ان کا چہرہ اور مزاج مرچیلا ہو جاتا ہے۔

کلیم الزماں: عقیل کے لئے تھوڑا سا علیحدہ بنا لیجئے گا۔

عالم آرا: اگر حلیم میں مرچیں نہ ہوں تو وہ صرف دالوں کا ملغوبہ رہ جاتا ہے اور یہاں لاہور والوں کو تو حلیم پکانے اور کھانے کا سلیقہ ہی نہیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! ہر جگہ ایک سی چیز نہیں ملتی۔ پشاور میں چپلی کباب بہترین ملتے ہیں۔ راولپنڈی کی باقر خانی مشہور ہے اور کراچی کی بریانی اور حلیم، اور حلیم بھی وہ جو کسی اچھے ہوٹل کی ہو۔ ورنہ عام دکاندار تو حلیم میں مرچوں کے علاوہ روئی بھی ڈال دیتے ہیں۔ حلیم دراصل دلی اور لکھنؤ کی پیداوار ہے اور یہاں لاہور کے تو گردے، کپورے، لسی اور مرغ چھولے مشہور ہیں۔ اس حلیم کا کہنا ہی کیا جو دلی کی شاہی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس ملتی ہے۔ عام طور پر حلیم کو پتیلوں میں اور چولہوں پر بنایا جاتا ہے لیکن جو بازاروں میں دکان لگا کر حلیم بیچتے ہیں ان کے ہاں حلیم کو مٹکوں میں پکایا جاتا ہے جو زمین میں گڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا چولہا بھی زیرِ زمین ہوتا ہے۔ اس طرح کی حلیم کو کھانے کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ کلیم الزماں نے اپنے باورچی کو بلایا اور اسے حلیم تیار کرنے کے لئے ہدایات دیں کہ حلیم کے ساتھ سبز مرچ کٹی ہوئی، کالی مرچ، لیموں کٹے ہوئے، ادرک باریک کٹا ہوا اور پیاز کے لچھے گھی میں تلے ہوئے اور ساتھ دہی بھی، اور اعلان کر دیا کہ حلیم آج

نہیں کل ملے گی کیونکہ اسے ساری رات چولہے پر رہنا ہے۔ سب لوگوں نے ناشتہ کرلیا تھا اس لئے سب اٹھ گئے لیکن عالم آرا کلیم الزماں کے پاس ہی بیٹھی رہی اور کلیم الزماں سے کچھ پوچھنے والی تھی کہ انہوں نے کہا کہ تم مطالعہ کے کمرے میں چلو میں ذرا فارغ ہوکر آتا ہوں اور پھر فراغت کے بعد کلیم الزماں نے کہا بیٹی! تم کچھ پوچھنے والی تھیں۔

عالم آرا: جی ابو میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں آپ کو روزانہ دیکھتی ہوں۔ آپکے معمولات کو دیکھتی ہوں، پھر معلوم نہیں آپ کو خیر کے پلڑے کی کیوں فکر ہے۔

کلیم الزماں: بیٹی! اگلے دن ٹی وی پر ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شاید حضور ﷺ سے یا کسی اور سے سنا کہ تمام بنی نوع جنت میں داخل ہوگی سوائے ایک فرد کے تو ان پر یہ خوف طاری ہوا کہ وہ فرد وہ خود تو نہیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب ان پر نزع کا عالم طاری تھا تو انہوں نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ کاش! عمر یہ تنکا ہوتا تاکہ اسے باز پرس اور جوابدہی کا خوف نہ ہوتا۔ اگر صحابہ کرام کا حال یہ ہو تو کلیم الزماں کس کھیت کی مولی ہے کہ ہر وقت جوابدہی کا خطرہ نہ ہو اور میں جانتا ہوں کہ وکیل کی حیثیت سے اور پھر جج کی حیثیت سے مجھ سے کیا کیا کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ میں اپنے موجودہ عمل سے تمہاری اور دوسرے اہل خانہ کی تربیت سے اپنی گذشتہ زندگی کی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ وہ دیکھو (دیوار پر لگے ہوئے کتبے کی طرف اشارہ کر کے) اس کتبے کا کیا مطلب ہے؟ ''ان الحسنات یذھبن السیآت''۔ مطلب ہے کہ نیکیاں گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔

عالم آرا: ابو! آپ کے متعلق تو مشہور ہے کہ وکیل کی حیثیت سے آپ اپنے ہم پیشہ لوگوں میں قابلیت کی بناء پر بڑے سربرآوردہ سمجھے جاتے تھے اور جج کی حیثیت سے بھی آپ کے فیصلے دوسرے وکلاء اور جج حضرات کے لئے قابل ستائش ہیں جن سے وہ لوگ راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! یہ دو اور دو چار کی طرح نہایت آسان سوال ہے جس سے ناواقفیت کی وجہ سے لوگ وکلاء حضرات کو معاشرے کی کریم سمجھتے ہیں۔ ایسے وکلاء بھی ہیں جنہیں ہم معاشرے کی کریم کہنے پر حق بجانب ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے ورنہ ان کی اکثریت تو یوکریم ہی ہے۔ ہمارے ایک ملنے والے صاحب تھے۔ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ نام ان کا تھا مرزا اسلم بیگ۔ مفلسی کے باوجود بڑی محنت سے وکالت تک پہنچے۔ تھوڑی مدت تک وکالت کی۔ ایک دن ایک غم زدہ خاتون ان کے پاس آئی۔ شاید کوئی خاندانی جھگڑا تھا میاں بیوی کے درمیان۔ فیس کے طور پر خاتون نے اپنا زیور اتار کر آنسو بھری آنکھوں سے دینا چاہا۔ مرزا صاحب پر رقت طاری ہوگئی۔ اس کا مقدمہ بغیر فیس کے لڑا اور پھر قانون کی جو دو چار کتابیں ان کے پاس تھیں ان پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی اور پھر ساری عمر مختلف کمپنیوں میں لیگل ایڈوائزر کی حیثیت سے ملازمت کرتے رہے۔ بیٹی! ایسے لوگ بھی ہیں لیکن آٹے میں نمک کی طرح۔

عالم آرا: ابو! یہ دو اور دو چار والی آسان بات کی وضاحت کریں۔

کلیم الزماں: فرض کیا کہ عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ مدعی کوئی دعویٰ کرتا ہے اور مدعا علیہ اس دعویٰ کا جواب دیتا ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ میں ایک حق پر ہے اور دوسرا ناحق پر۔ دونوں کے وکلاء دلائل دیتے ہیں۔ اگر ناحق والے کا وکیل

زیادہ ہوشیار ہے تو وہ اپنی چرب زبانی سے فیصلہ اپنے موکل کے حق میں کرالیگا۔لیکن وکالت تو اس کا پیشہ ہے اور اسی سے اس نے اپنی روزی بھی کمانی ہے اور اپنا مقام بھی بنانا ہے۔تھوڑی ہی مدت کے بعد اس کا ضمیر مردہ ہو جائیگا اور حالت یہ ہو جائے گی کہ ؎

خرد کا نام جنوں رکھدیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ناحق کو حق ثابت کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا اور جب اس کی شہرت لب بام پہنچے گی تو حکومت اسے عدالت کی کرسی پیش کرے گی اور وہ ایک ہی جست میں چور سے قطب ہو جائے گا اور یہ بھی نہ بھولو کہ صرف چرب زبانی ہی کام آتی ہے۔وکیل اور جج کے درمیان اور بھی رابطے ہوتے ہیں جن کی مدعی اور مدعا علیہ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ساری عمر عدالت میں خود جھوٹ بول کر اور موکل سے جھوٹ بلوا کر ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی رہ سکتی ہے؟ہاں اگر کوئی شعیب آئے میسر تو شبانی سے کلیمی دو قدم ہے اور میری خوش قسمتی کہ مجھے علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویز کی صورت میں دو شعیب میسر آ گئے اور نخل سینا پر برق پاشی ہو گئی۔

عالم آرا: ابو!میں آپ سے آج ایک دو اشعار کا مطلب سمجھنا چاہتی ہوں۔

کلیم الزماں: بیٹی!کبھی تمہاری امی کی حلیم مجھے آف ٹریک کر دیتی ہے اور کبھی تمہارے سوالات۔میں چاہتا ہوں کہ سورہ خاشیہ کے وہ احکام تمہیں سمجھا دوں تا کہ تم ان لوگوں کے کام آسکو جن کا ذکر سورۃ نازعات کی پہلی آیت میں زیر بحث آچکا ہے۔پہلے ہم بادلوں پر گفتگو کرتے ہیں کیونکہ انہی کے ذریعہ سے ہمیں وہ پانی ملتا ہے جس پر زندگی کا دارومدار ہے۔پہلے بھی ان کا ذکر آچکا ہے لیکن بات ادھوری رہ گئی تھی۔زمین پر جاندار مخلوق کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ پانی ہے اور ایسا پانی جو جاندار مخلوق کے لئے ممد حیات ہو،وہ صرف بادلوں ہی سے حاصل ہوتا ہے۔جو کبھی دریاؤں کے ذریعہ سے اور کبھی زیر زمین ذخائر سے حاصل کیا جاتا ہے۔ہمارے ملک میں آبپاشی کے سارے نظام کا انحصار بادلوں پر ہے۔بادلوں سے برسنے والے پانی ہی سے ہمارے ڈیم بھرتے ہیں جو آبپاشی کے ساتھ ساتھ پن بجلی اور پن چکیوں کے نظام کو توانائی بخشتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انسان کی مادی ضرورت کے ساتھ اس کی جمالیاتی حس کا بھی خیال رکھا ہے۔تم نے مشہور انگریزی شاعر کیٹس (Keats) کا مصرعہ سنا ہوگا۔

My heart Leaps up when I see a Rainbow in the sky.

اور پھر جب ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو تو اسی سے محظوظ ہوتے ہوئے کتنا لطف آتا ہے (مسکراتے ہوئے) اور جب کبھی تم ایسے موسم میں عقیل میاں کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل جاتی ہو تو کتنا لطف آتا ہوگا۔کلیم الزماں کی طرف دیکھ کر عالم آرا زیر لب مسکراتی ہے جس میں حیا کا پہلو غالب ہے اور کلیم الزماں عالم آرا کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔میں بھی کبھی حلیمہ بیگم صاحبہ کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جایا کرتا تھا لیکن یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا۔

عالم آرا: ابو!میں سوچتی ہوں کہ کالج میں اگر آپ میرے استاد ہوتے تو میری شخصیت کچھ اور ہوتی۔آپکا بات کو سمجھانے کا انداز بہت خوبصورت ہے۔

کلیم الزماں: بیٹی!جب تم خود اپنے سکول کی پرنسپل ہوگی تو انشاء اللہ سورۃ نازعات کا غنچہ گل صد برگ بن کر تمہیں وہ کچھ بنا دے گا جس کی تم تمنا کر رہی ہو۔ہاں تو بات بادلوں کی ہو رہی تھی۔مشرق میں تو بس بادل کو بادل کہہ دیا یا زیادہ سے

زیادہ گھٹا یا کالی گھٹا، مغرب کے علمائے موسمیات نے بادلوں کی کئی اقسام گنوائی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی خصوصیت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح کسی علاقے کی آب وہوا اور روزانہ بدلتے ہوئے موسم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی علم کی بنا پر وہ موسم کی تبدیلی کی پیش گوئی کر دیتے ہیں اور آجکل یہ پیش گوئیاں ہوائی سفر کے لئے کتنی مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہواؤں کے چلنے کا علم بھی منسلک ہے کیونکہ بادل ہواؤں کے دوش پر ہی سوار ہو کر اپنا سفر کرتے ہیں۔ جسے علم موسمیات کہتے ہیں۔ اس کے دائرے میں کئی علوم آجاتے ہیں اور موسمیات پر ہی کیا منحصر ہے علوم بالحواس کی دنیا اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ فلاں علم ایک مقام پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ ہر علم دوسرے علوم کے ساتھ کچھ نہ کچھ رابطہ ضرور رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ پہاڑوں کو دیکھو ان کے لئے نصب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مجھے پہاڑوں کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں۔

Internal Combustion انجن کے اوپر ایک چھوٹا سا آلہ لگا ہوتا ہے۔ جسے گورنر کہتے ہیں وہ انجن کی رفتار کو باقاعدہ رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زمین کی محوری اور مداری گردش کو کنٹرول کرنے میں پہاڑوں کا کچھ کردار ہو کیونکہ ماہرین فلکیات کے علم کے مطابق زمین کی گردشوں میں کھڑکھڑے لٹو کی سی بے قاعدگی موجود ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑ پانی کو برف بنا کر پانی کے ذخائر کا کام کرتے ہیں جو سارا سال ندی نالوں اور دریاؤں میں بتدریج بہتا رہتا ہے۔ پہاڑ ہواؤں اور ان کے ساتھ بادلوں کا رخ بھی متعین کرتے ہیں۔ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو شاید دریائے سندھ اور گنگا کی وادیاں بھی نہ ہوتیں۔

علامہ اقبال نے ہمالیہ پہاڑ کو مخاطب کر کے کہا ہے ؎

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

لیکن مسلمان چشم بینا کہاں سے لائے، مغرب کے دلیر مجاہد چاند پر پہنچ گئے اور یہ ابھی تک یہ کہہ رہے ہیں۔

گھٹا سے چاند آرہا ہے باہر وہ رخ سے گیسو ہٹا رہے ہیں نکھر رہا ہے تمام عالم فضا میں جلوے سما رہے ہیں

ملا کی دوڑ مسجد تک ہے ورنہ قرآن مجید کہتا ہے کہ سرخ وسفید اور کالی پیلی چٹانوں کو دیکھو، ان میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں بے شمار قسم کے قیمتی پتھر اور کئی قسم کی معدنیات موجود ہیں لیکن ہم نے تحقیق کرنا اپنے لئے حرام سمجھا ہوا ہے۔ الغرض یہ موضوع ایسا ہے جس پر تحقیق جاری ہے اور علم الجبال کے ماہر نہ معلوم مستقبل میں کیسے حقائق واشگاف کریں گے۔ اسکے بعد ہم سماء کو لیتے ہیں۔ ''سماء'' کا مطلب پوری کائنات بھی ہوسکتا ہے۔ فضائی کرّوں کے لئے بھی سماء کا لفظ استعمال ہوا ہے اور فضا کے لئے بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ چیزیں بھی آسمان کی طرف دیکھنے سے نیلی نظر آتی ہیں اور جس میں رات کے وقت ستارے چمکتے ہیں۔ اس علم کو فلکیات کہا جاتا ہے یا علم الافلاک۔ قریبی سماء کی گہرائی چودہ میل بتائی جاتی ہے۔ جس کی مدد سے سورج کی روشنی زمین تک پہنچتی ہے۔ انسان کی طبیعت میں جستجو کے عنصر نے اسے چاند تک تو رسائی دے دی ہے اور اب وہ مریخ پر کمند ڈال رہا ہے۔ سائنسدانوں کا بھیجا ہوا روبوٹ مریخ پر اتر چکا ہے۔ دیکھیں وہ کس قسم کی معلومات فراہم کرتا ہے۔ جستجو کے اسی جذبہ کو سراہتے ہوئے علامہ نے کہا تھا۔

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی درماں نیافریدی آزار جستجو را

(ترجمہ: خوش ہوں کہ عاشقوں کو تو نے ہمیشہ کے لئے سوز بخش دیا (لیکن) جستجو کے آزار کا کوئی علاج تو نے

پیدا نہیں کیا۔)

علم افلاک ایک وسیع علم ہے اس کو حاصل کرتے ہوئے اور اس کے مختلف مظاہر پر تحقیق کرتے ہوئے علمائے فلکیات کی عمریں گزر گئی ہیں لیکن اس علم کی تشنگی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اسی طرح سورج ہے جو زمین سے کئی لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کی روشنی اور حرارت زندگی کے لئے پانی کے بعد ضروری اور اہم ہے کیونکہ پانی کی موجودگی کے باوجود اگر سورج کی روشنی اور حرارت نہ ہو تو زندگی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ پنپ سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی سورج کی اس اہمیت کے پیش نظر بانگ درا میں ایک نظم ''آفتاب'' کے نام سے کہی ہے جس کے دو شعر یہ ہیں۔ ویسے پوری نظم مطالعہ کے لئے انسان میں روشن ضمیری پیدا کرنے کے لئے بڑی اہم ہے۔

اے آفتاب روح و روان جہاں ہے تو — شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا — ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

یہاں چوتھے مصرع میں لفظ ''سبز'' سے علامہ کا اشارہ غالباً کلوروفل ایفیکٹ کی طرف ہے۔

عالم آرا: یہ کلوروفل ایفیکٹ کیا ہوتا ہے؟

کلیم الزماں: بیٹی! اس کی علمی حیثیت سے تو میں واقف نہیں کیونکہ یہ مسئلہ خالصتاً سائنسی ہے۔ اتنا ضرور مشاہدہ میں آیا ہے کہ اگر پودوں کو روشنی نہ ملے تو وہ زرد ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد مرجھا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اچھا تو اس کے بعد ہم زمین کی طرف آتے ہیں۔ زمین کے متعلق علم رکھنا انسان کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس علم کی ضرورت کے باوجود مشہور ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ دونوں ہیں بے حیا۔ ادھر یاد کر اور ادھر بھول جا۔ (باپ بیٹی دونوں ہنستے ہیں)۔ جغرافیہ کیا ہے اپنے ماحول سے واقفیت اور اگر اس واقفیت کو علمی سطح پر حاصل کیا جائے تو یہی علم جغرافیہ بن جاتا ہے۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ انسان کی یا دوسری جاندار اشیاء کی زندگی کا انحصار انہی اشیاء پر ہے جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مختلف علوم کا حصول ضروری ہے۔ اسی کو تسخیر کائنات کہا جاتا ہے جسکی تاکید قرآن مجید نے کی ہے۔ انسان کی یہی خصوصیت کہ وہ اپنے ماحول سے واقفیت حاصل کر کے اس کو تسخیر کرنے اور اس سے حسب منشاء فائدہ اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے جو اسے انسان بناتی ہے اور ماحول سے مراد ارض وسماء مافیھا ہے۔ علم الارض کو جغرافیہ کہا جاتا ہے۔ اسکی کئی شاخیں ہیں مثلاً طبعی جغرافیہ، سیاسی جغرافیہ، اقتصادی جغرافیہ۔ پولیٹیکل جغرافیہ کی مثال یہ ہے کہ جنگ عظیم اول کے دوران ایک جغرافیہ دان مسٹر الائیڈ نے پیش گوئی کی تھی کہ جنگ ختم ہوتے ہی یورپ میں ایک نیا ملک وجود میں آئے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جنگ ختم ہوتے ہی چیکوسلوواکیہ نے جنم لیا۔ ایک امریکی جغرافیہ دان مسٹر کیمپل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ، "امریکہ نے جہاں بھی کوئی جنگ ہاری ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے سپاہی اس علاقے کے جغرافیہ سے ناواقف تھے جہاں وہ جنگ کے لئے بھیجے گئے تھے"۔ اقتصادی جغرافیہ اسے کہتے ہیں کہ معلوم ہو جائے کہ کس علاقے کی پیداوار کیا ہے، اسے انسان اپنے لئے کیسے استعمال

کرسکتا ہے اور اس کی تجارت کس انداز سے ہوسکتی ہے۔ طبعی جغرافیہ کی مثالیں تو دی جا چکی ہیں۔ اس کے لئے ایک عظیم علم طبقات الارض ہے جس کے ذریعہ زمین کے اندر موجود اشیاء کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اسی علم کے ساتھ زلزلوں کا علم وابستہ ہے۔ یہ تمام علوم جو گنوائے گئے ہیں مرئی اشیاء کے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ غیر مرئی اشیاء یا قوی کا علم ہے جس کے انکشاف کا سہرا برصغیر کے ایک بنگالی سائنسدان جگدیش چندر بھوس کے سر ہے۔ اس نے فضا میں موجود ریڈیائی لہروں کا انکشاف کیا اور یہ ثابت کیا کہ پودوں میں بھی زندگی موجود ہے اور وہ بھی کسی عمل کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ ریڈیو کے موجد مارکونی نے جگدیش چندر بھوس کی ہدایت کے بعد ریڈیو کی ایجاد کی۔ اسی علم کی بدولت کمپیوٹر ایجاد ہوا۔ اسی علم نے انسان کو چاند تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دی اور آج اسی علم کی بدولت ہر گھر میں ٹیلی ویژن موجود ہے۔ ہر جیب میں موبائل ٹیلی فون بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انہی علوم کو قرآن مجید علم کہتا ہے اور ان کے حصول کے بعد انسان انسان بنتا ہے ورنہ اس کی حیثیت جانوروں کی طرح ہوتی ہے کہ، پیدا ہوتا ہے، زندگی بھر کھاتا پیتا ہے، اولاد پیدا کرتا ہے، جاگتا سوتا ہے اور آخر ہمیشہ کے لئے سو جاتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی زندگی کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

عالم آرا: ابو! آپ نے بڑی اچھی معلومات فراہم کی ہیں لیکن آپ کی تقریر میں قرآن وحدیث یعنی قرآنی علوم کا کوئی ذکر نہیں۔

کلیم الزماں: بیٹی! قرآنی علم کو ہم علم الاخلاق کہیں گے۔ علم الاخلاق کا وظیفہ کیا ہے یہی کہ طبعی علوم کے حصول سے جو فوائد حاصل ہونگے انہیں کیسے استعمال کیا جائیگا۔ اگر طبعی علم حاصل نہ کیا جائے تو علم الاخلاق ایک کھوکھلا علم رہ جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے طبعی علوم سیکھنے کی تاکید کی ہے۔ علامہ اقبال طبعی علوم کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن

علم اسما اعتبار آدم است حکمت اشیاء حصار آدم است

عالم آرا: ابو! آپ نے تو مجھے بھی نخل سینا بنا دیا۔

کلیم الزماں: بیٹی! ابھی منزل دور ہے۔ آپکا نخل سینا اس وقت بارآور ہوگا جب ہمارے بچے فارغ التحصیل ہوکر عملی زندگی کا آغاز کریں گے۔ سکول کا نام ہوگا، ''نخل سینا سکول'' یہ ایک تحریک ہوگی۔ میرے ذہن میں ہے کہ اسی سکیم کے تحت پرائمری اور سکینڈری سکول بھی کھولے جائیں گے۔ کالج اور یونیورسٹی کے لیول تک جانا ہوگا اور یہ ساری عالم آرائی، عالم آرا کے ہاتھوں ہوگی۔ میری تمنا ہے کہ یہ تحریک علی گڑھ تحریک کی طرح بارآور ہو اور ہمارے سکول کا ہر بچہ شہزادرائے یا ابرارالحق بن جائے۔ بیٹی! جاؤ اب آرام کرو یہ باتیں تو جب تک زندگی ہے چلتی ہی رہیں گی۔

وہ کون سا دماغ ہے

جس میں ـــــ اِس قسم کے سوالات نہیں اُبھرتے کہ:

- کیا انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوئی ہے؟
- کیا سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے؟
- کیا غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہے کہ وہ ساری عمر دھکے کھاتے رہیں؟
- کیا خدا کو ایسا ہی منظور ہے؟
- کیا موت کا ایک دن مقرر ہے یا وہ آگے پیچھے بھی ہو سکتی ہے؟
- بعض بچے پیدائشی اندھے، لولے، لنگڑے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا یہ بھی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے؟
- اگر خدا کے ہاں عدل ہے تو وہ ظالموں کو ظلم سے کیوں نہیں روکتا؟
- کیا دُعا سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ اگر نہیں بدلتی تو ہم دُعا کیوں کرتے ہیں؟
- یہ اور اسی قسم کے دیگر سوالات کا تعلق مسئلۂ **تقدیر** سے ہے۔ جس نے انسانی ذہن کو ہمیشہ طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔

یہی وہ مسئلہ تھا جس کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے کارل مارکس نے کہہ دیا کہ:

مذہب عوام کے لئے افیون ہے

جناب پرویزؒ نے ـــــ دُنیا کے اِس مشکل ترین مسئلہ کو ـــــ اپنی تصنیف

کِتابُ التّقدیر

میں، قرآنِ کریم کی روشنی میں، اس عمدگی سے حل کر دیا ہے کہ اس کے بعد ذہن میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔ کتاب بڑے سائز کے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

جلد مضبوط ـــــ اور گرد پوش جاذب نگاہ۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 بی، گلبرگ 2، لاہور
tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com
www.facebook.com/tolueislam.trust
Phone: +92 42 35753666

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546 Idara@toluislam.com

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) –

Message to Fellow-Seekers

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1957)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

Longing for the past melodies and chords;
The heart is sad; craving for lovely words!
Synagogues, Mosques, Shrines, and Minsters;
All are corrupted by half eyed Ministers!

Dear Brothers, *Assalaamu Alaikum wa Rahmatullah*!

Those of you who participated in last year's convention may remember the scene when everyone was embracing everyone else before departing. It was as if the atmosphere was glowing with lights of love and sincerity. It was as if our minds got filled with sublime memory of three days of nonstop heavenly talks and discussions. It was as if our breasts exuded with sacred blustery emotions. And our hearts became full with lovely wishes; our eyes filled with pearly tears; and our lips started humming with this warm and deeply moving message:

Departing and coming have their own unique sweet joys;
Depart hundred times and come hundred thousand times!

Alhamdulillah! After one year the bearers of the cup – made of the essence of the Quran – have arrived here again with such warm feelings, happiness and determination and courage that they are ready to say:

Come! Let us build an Ummah; Life's struggle is for the brave hearted!
Ignore the cry in the city mosque; the lazy Mullah's heart seems melted!

The Quran says: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (10:58) – Tell them it is only through the Mercy of your Sustainer that you have received this. You should, therefore, rejoice over it. So, go forth with the Quranic message in your hands and create a movement. Let us free people's hearts and minds from the clutches of the Mullah. But before I begin, let me offer my sincere thanks on your behalf to the extremely sincere volunteers of Bazm Rawalpindi, who, by carrying the burden of the logistics and support for this convention, have so graciously made the second destination of this caravan of love and fortitude as

tranquil and as comfortable as the first one.

Self-Accountability

My dear friends, congregations like these are like the Day of Accountability in the life of nations. This means doing accountability analysis of the resolutions that were agreed upon last year; and to chart out the future direction. Please remember! If a traveler does not stop and check from time to time whether or not he is following the right path, he will never be sure of reaching his destination. A businessman who does not check his accounts from time to time will not be sure of the state of his business: of whether he is running a profit or loss; of whether or not all his hard work is driving the business in the right direction. In these three days you should do the same things. But as I explained last year, the standard of measuring profit or loss is different for a nation that rises up to establish the Quranic system of sustenance; and which signs a business contract with none other than the Almighty Allah. Standard metrics of success or failure of traditional groups are: how many new members it attracted; how much additional revenue it generated; how many events it organized; how many processions it took out; how many seats it captured in an election; and what kinds of tactics it followed to suppress its critics' voices etc.?

But the proponents of a Quranic system have to see how much change has occurred in their inner selves; they have to observe to what degree their hearts and minds have become tuned to the Quranic thoughts; they have to monitor to what degree their character and disposition have become aligned with the essence of the Quran; they have to analyze to what degree their desires and goals of life are in synch with the Quranic goals; they have to be vigilant to what degree they observe the laws of Allah when dealing with their relatives and friends and other human beings, etc.? If we have not created inner changes along these Quranic lines then no matter how much progress we may have made along other lines it counts for nothing on the Quranic scale. But if we have been able to achieve positive changes in our character and behavior according to measures as described above then it would indeed be a great achievement. But it does not mean that we are exempt from material means and resources; or that we should not try for them. The Quran, in fact, puts great emphasis on acquiring material forces of nature: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (8:60) – keep ready what force you can muster to meet your enemy together with strong cavalry [Asad]. Therefore, physical means to achieve goals are absolutely required. But what I am trying to convey is that if these

inner changes have occurred inside our hearts then despite the lack of physical resources we will be called successful by the Quran; and the cosmic laws of Allah will rise up to defend us against our opposition and enemies and tell them:

Do not misjudge the true passionate Quran devotees:
These dervishes are the real treasures of the caravan!

But if we would like to succeed on the basis of material means without the inner change then we will be reprimanded by the same laws.

This isn't for you; this is the world of struggles and pain;
This is a journey of heart-wrenching and restless souls!
You can't know the source of tears coming from the eyes?
The dewdrops on flower petals are not the princely pearls?

And, my friends, it is obvious that those who get reprimanded by the Almighty and the ultimate Authority will never get shelter anywhere: وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (9:74) – And there will not be for them on earth any protector or helper [Asad].

How to create inner change?

People often ask me: we have understood the Quranic thought but we do not know how to create the inner change? Well, the answer in one word is that it is created by *Iman*. But my experience has taught me that by merely saying this, does not solve the problem. People do not understand the full depth of the meaning contained in the word "Iman." We all claim – and we sincerely believe in the claim – that we have "Iman." But despite this the inner change does not take place within us. The reason is that we have actually not *understood* the meaning of Iman. If we really had understood what Iman is, then it would never be the case that inner change doesn't happen or vice versa. In truth, without this inner change we will not rest easy; or proclaim that we have Iman, my friends.

Let us explain this with an example. Suppose you are extremely hungry and someone brings to you a plate of delicious food. You feel so happy with its mesmerizing aroma that you quickly dig into it, and while you are about to put the first bite of the food in your mouth that suddenly the person tells you that the food has pure ingredients except that the chef by mistake put cyanide (poison) instead of salt. Now please tell me: will you throw the food away or put it in your mouth? It is obvious that you will throw it no matter how hungry

you were. Why did you do that? Why would you loathe even to go near such a food? Just a minute ago you had jumped at the food but then what happened to you? What kind of change occurred within you that you want to run away from such a food even though you were extremely hungry? The reason is obvious. You know that if you eat this food then you will die. This, my friends, is called *Iman*. To understand the reality of Iman let us say that instead of cyanide if you were told that this food has been prepared with haram (stolen) money – then would your reaction be the same as that when you were told that the food was laced with poison? Most likely it will not be the case. Why a different reaction this time then? Well, it is because we have Iman that poison kills us but we do not have Iman that haram wealth kills us too. If we had Iman that haram wealth kills us too then our reaction would have been the same as it was in the case of poison. Let us please keep, my friends, this example in front of us and ask ourselves: Do we believe that by violating the Quranic values our humanity dies if we violate its warning – just as we believe that physical death occurs by poison if we ingest it? If we do not have this belief about the Quranic values then how can this inner change take place within us as mentioned above? If we have this kind of Iman then it will never be the case that the inner change does not take place?

How to create this kind of Iman

People ask how to create such Iman regarding the Quranic values? Well, it will help if we could focus on how was this Iman about cyanide – that it kills – produced? These could be its following forms:

(1) We have seen a person die who ingested it. Or,
(2) By doing analysis in lab and concluding intellectually that it kills. Or,
(3) If we do not have the wherewithal for doing this analysis intellectually or if we do not want to take the trouble of doing this ourselves, then asking someone who has. Or,
(4) If we even can't do this, then reading a book about it. Then our personal experience would tell us whether or not the author told the truth about it.

These could be the ways to find out whether or not cyanide is really a source of physical death. From the human physical level, let us now move to the level of human self or personality. It is clear that death of our "humanity" or "self" does not occur in the same perceptible way as it happens in the case of the physical death. Therefore, there is no question of believing it by seeing it. Then the other way is by doing research by one himself. But how many of us will be ready to undertake this heart-wrenching and extremely exhausting task? So,

the next best way for one is to ask someone who has – and satisfy himself.
This is called intellectual way of learning and thinking. This is the way to create Iman using knowledge, reason, and thought that has been so much stressed in the Quran. In this connection much literature has been published by Tulu-e-Islam; and so much material is available in my books that it is not necessary to go into details here. However, I want to make it clear that in this way of creating Iman no one is forced into believing nor anyone's intellect is subdued – because the Quran clearly forbids this: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) – If Allah, the Almighty wanted then He would have made everyone a believer in the human sphere as it is the case in the natural domain. But Allah did not wish to exercise compulsion. He made the right and wrong path clear; and left man free to choose either path of his own freewill.
So, my dear friends, this is the only way – i.e., using knowledge, reason, and thought and by freedom of choice – to create Iman in our hearts. But please understand clearly that this is not something that someone else could create inside your heart. That you have to do yourself. What someone could do at most is to make you aware of its reality, and explain to you what you do not know. But he cannot drive Iman inside your heart no matter how much he wants. So much so that even the Prophet (PBUH) was told in the Quran: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (28:56) – O Prophet (PBUH)! Your mission is to keep on delivering the right message to these people. As regards making the people adopt the right course, that is not your responsibility. In fact it is not even within your reach that everyone whom you would like to take the right path necessarily adopts it. The only person who would take the right path is the one who himself wishes to do so. How come can one come to the right path when one does not want to utilize his human faculties of intellect and reason; and, instead, follows a path blindly – i.e., with his mental eyes closed? Allah knows very well the people who, after due thought and understanding, take the right path with full consciousness. This is the law of Allah. And one who does not follow this law of acquiring Iman – with due thought and understanding; deep pondering, knowledge, and reason – cannot create Iman inside one's heart, and so gets astray from the right path: وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ۭ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (9:127) – When any revelation is sent down which refers to the hypocrites, they look at each other and exclaim: "Does anyone suspect that this refers to any of us?" Then they turn aside. And turning aside thus makes their hearts turn away. This is because they have lost their capacity of understanding.

Did you notice my friends, that to tread the right path – that is to create Iman and to produce the right inner change within oneself – how fundamental is the requirement of knowledge, thought, and reasoning? It is clear from this that if this kind of Iman does not arise in one's heart then he should note that either he does not understand that to lead life against Quranic values leads to death of the self; or that if he has understood it, but, in spite of his understanding, he does not want to have this kind of Iman; then it means only one thing: he is not interested in being saved. For this kind of person understanding of reality, makes no difference. One who doesn't take life seriously and does not give it due importance, it is one and the same if he is warned or not that cyanide kills. سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2:6) – Whether or not they are warned about the disastrous consequences of following the wrong path, it is the same for them. They will never adopt the right path. This is why, right in the beginning, the Quran has said that this divine code will benefit those who want to protect themselves from life's dangers and pitfalls: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2).

The Prophet (PBUH) taught and fully explained, through Quranic teaching and its wisdom, both these life's paths – the right path and the wrong path. Those who understood it – and after understanding they decided to protect themselves from the death-valleys of life – they created Iman in their hearts of such a strong type that no amount of hardships put up in their way and no amount of greed thrown at them could sway them to the wrong path even one inch from their Iman of 100% commitment to the right path. A person who wants to save himself from death would never look at cyanide-laden food no matter how much he is tortured and no matter a mountain of wealth is kept in front of him. With every strike of whip he will pronounce with his lips in witness of لا إلـه إلا الله like Bilal (R) did. And, he will kick with disdain every offer of pile of gold and silver made to him in the foot-step of the Prophet (PBUH) – that even if you put sun on my one hand and the moon on the other I am not going to budge even an inch from the right path. Because: اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ (6:15) عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ – If I revolted against Allah's laws, I too would be fearful of chastisement on the Day of Reckoning. I know that if I swayed from the right path then it will lead only to destruction

This, my friends, is the Iman based on knowledge and thought that produces such revolution in human hearts that it changes everything: life's point of view; life's values and their measure; life's concept and goals; life's path and life's end. In the words of the Quran, the earth and the heaven get changed with such a kind of Iman. And a new world appears on the world-stage with all its beauty and attractions in place of the old lifeless rustic world. This is the reality

which Iqbal pointed out when he said:

One who is yearning to die for the truth's sake!
First should create life in his body's dead pale.
He should burn the borrowed earth and skyway!
And then from its ashes should create his own way.

From this you can see the reality of why the Quran raises its structure of life on the foundation of Iman? This is because without this foundation (of Iman) no brick of this structure will fall into right place. And neither will the deep passion for just deeds will arise in anyone's heart without this kind of Iman. It is the miracle of this Iman that drives one to passionately embark on the journey that leads him to pronounce آذان (*Adhaan*) sometimes in the simmering heat of the deserts of Africa and sometimes in the sky-high cathedrals of Europe:

I sing the sweet melody and say the familiar message;
But this is just an excuse to find a truthful confidante!

From this Iman he acquires such a power (سُلطان) in his heart that he surpasses the boundaries of heavens: مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (55:33).

When in this fiery soil-being such a deep Iman arises;
Then it creates wings of Gabriel to fly past the paradise!

Therefore, my dear friends, if someone complains: why does this deep passionate Iman not arise in his heart? Why does his mind not become laser-focused on creating this inner change? Why does the fearless flame of conviction not arise out of his personality? Why doesn't his desire become deeply rooted in this Iman? And why do his courage and self-confidence not lift up? Then please tell him:

O Heedless! Create conviction because you have been overtaken by doubts.

***

Allah's دین (*Deen*)

And now, my dear friends, I want to draw your attention to an important aspect. The Quran says: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (3:83) – This is the دین (*Deen*) ordained by Allah. Do they desire to follow a دین (*Deen*) other than this, when they can see that everything in the universe submits to Allah's Laws willingly or unwillingly, and follows the way which leads to the goal set for them by Allah? There is a great reality that is brought out in this verse, which is: that everything in Universe (including human beings) submits to laws of Allah: اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (19:93) –

There is nothing in the universe that does not bow before Allah's Laws in complete obedience.

Submit – willingly or unwillingly

As for the external Universe, everything except humans bows down before Allah's Laws willingly: ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (41:11) – In this way the Almighty turned towards the celestial bodies. At that stage they were all in the form of gas (nebula). We told them, "You must obey Our Laws willingly or unwillingly." They replied, "Why unwillingly? We shall obey these Laws most willingly. Whereas from among humans there is a group that obeys the laws of Allah willingly but there is another group that is forced into obedience of these laws by the cosmic forces of Allah which are commonly referred to as the demands of the time. The مومنین (*Momineen*) in the first period of Islam followed Allah's laws willingly and sincerely with total submission of their hearts and minds. And within few years they created such a revolution that is unparalleled in the entire history of the world. The latter-day Muslims abandoned the obedience of Divine code of life and adopted the obedience of human-crafted code of life and slowly their condition turned so much against the Quran that: وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ (39:45) – People who do not believe in Allah's Law of Requital and life hereafter become extremely upset when told that supremacy and authority belongs to Allah alone; and that no one has any share in it. And: وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (17:46) –when you say that there is only one Allah they quickly turn their backs in aversion. Further: فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ۙ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۙ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ؕ (74: 49-51) – When all these facts have thus been explained to them, why is it that they turn away? Not only do they turn away, they also flee like frightened asses which have just seen a lion. But: وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45) – On the other hand when those who consider others besides God as being capable of intercession are mentioned, they begin to rejoice.

Our strangeness to the Quran and keeping people away from it

My dear friends, we can see how these verses have sketched the true picture of our attitude to the Quran during our more than thousand year old history since the first period of Islam. From every corner we hear the echo: that "Quran alone does not complete the دین (*Deen*)," although it's Author clearly and unambiguously proclaims: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (6:38) – nothing have We

neglected in Our Book. We hear the echo that "Quran is ambiguous," whereas the Quran itself says: كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (41:3) – Such a Book has been revealed. Its injunctions have been spelt out distinctly so that there is no doubt or ambiguity in it. Its language is also very explicit and clear, so that the people, who want to understand it by using their knowledge and reason, may understand its purport precisely. We hear the echo that "Quran is difficult to understand," whereas it's Almighty Author boldly declares: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (54:17) – For those who want to take advice, We have made this Quran easy to understand. We hear the echo that "Non-Quranic hadith narrations can abrogate the Quran's commandments," whereas the Quran declares: وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) – Allah's laws based on truth and justice have been set forth in this Book in a complete form. None has the authority to make any change in these laws.

Do you see, my dear friends, that there is no blame that we have not levelled against this Almighty's great Book; and there is no tactic that we have not used against it to keep people away from it?

Opposition to the Quran

Leaving aside the past, let us look at the present situation. The current opposition that is happening against the Quran's voice is not hidden from anyone's sight. What tactic is not there that is not being used to suppress the voice of the Quran; what "sacred" lie is not there that it is not being been told to "earn" rewards; what false charge is not there that is not crafted for the "great Jihad" being waged against the Quran's voice. But, my dear friends, despite all this opposition against it, how true it is what the Quran has said: that those who do not submit to its law willingly will be forced into its submission.

Yes! Forced into submission to the laws of Allah

Just few years back when Tulu-e-Islam raised its voice that the sources of sustenance should be under the control of the Divine system so that it could provide nourishment to all humankind, then a storm of opposition with ferocious intensity was waged against it. The Quran depicts the truth of their opposition thus: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ (22:72) – The condition of these people is such that when Our message is presented to them in all its clarity, they become agitated due to their repugnance and hatred. The effects of this agitation appear clearly on their faces, so much so that it seems they are about to assault those who convey Our Message to them. However, the demands of time have forced this opposition to say:

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 71
ISSUE
6

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/



عید مبارک

جشنِ نزولِ قرآنِ مجید پر پیشگی ہدیۂ تبریک قبول فرمایئے

اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آ گیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی رہنمائی، زندگی کی منزلِ مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔ کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ ایسے ضابطۂ حیات کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام ساز و سامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔

(القرآن الکریم، یونس:10، آیت:58)